توحیدِ عملی

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ:



تنظیم اسلامی

توحیدِ عملی

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین کی اہمیّت و فرضیّت

سورۂ زمر تا سورۂ شوریٰ کی روشنی میں



ڈاکٹر اسرار احمد

ترتیب وتسوید
شیخ جمیل الرحمٰن



تنظیمِ اسلامی

مرکز تنظیم اسلامی' 67۔اے علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو' لاہور
فون:6316638-6366638 فیکس:6305110
ای میل:markaz@tanzeem.org ویب سائٹ:www.tanzeem.org

نام کتاب: توحید عملی
طبع اوّل (مئی 2008ء): 1100
ناشر: تنظیم اسلامی پاکستان
مطبع: آئیڈیل پرنٹنگ پریس' لاہور
مقامِ اشاعت: 67۔اے' علامہ اقبال روڈ' گڑھی شاہو لاہور

ترتیب

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

اسلام کی حقیقت کو اگر ایک لفظ میں تعبیر کیا جائے تو وہ ''دینِ توحید'' ہے جس کی ضد شرک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں دو بار فرمایا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ اسے تو ہرگز معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے البتہ اس سے کم تر گناہ جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا!'' ــــــ قرآن و حدیث کے بنظرِ غائر مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ توحید اور شرک دونوں کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ فکر و نظر' خیال اور عقیدہ' اخلاق و کردار' مقاصد و مطالب' نجی رویہ اور اجتماعی نظام ــــــ غرض علم و عمل کی جو بھی خوبی' نیکی' بھلائی اور اعلیٰ قدر ہے وہ توحید ہی کے شجرۂ طیبہ کے برگ و بار کی حیثیت رکھتی ہے ــــــ اور اس کے برعکس ان جملہ اعتبارات سے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر جو بھی شر' بدی' ظلم اور تعدی ہے اس کا تعلق لامحالہ شرک ہی کے شجرۂ خبیثہ کے ساتھ ہے ــــــ!

لیکن افسوس کہ امتدادِ زمانہ اور علمی و عملی زوال کے ساتھ شرک کا تصور بھی صرف چند عقائد اور اعمال کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ گیا ــــــ اور توحید بھی صرف عقیدہ کا مسئلہ بن کر رہ گئی' جس پر بالکل صحیح ''مرثیہ'' کہا علامہ اقبال مرحوم و مغفور نے کہ ۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلہ علم کلام!

چنانچہ عوام کے نزدیک توحید صرف ایک عقیدہ ہے' ــــ اور خواص کہیں تو وحدت الشہود اور وحدت الوجود یعنی توحید وجودی کی بحثوں میں الجھ کر رہ گئے اور کہیں ع ''ہیں صفاتِ ذاتِ حق' حق سے جدا یا عینِ ذات!'' کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ راقم کی محدود معلومات کی حد تک صرف ایک امام ابن تیمیہؒ ایسی شخصیت گزرے ہیں جنہوں نے توحید فی العقیدہ کے ساتھ ساتھ توحید فی الطلب کا عنوان بھی قائم کیا۔

راقم الحروف اب سے لگ بھگ بیس اکیس سال قبل اپنے مسلسل درس قرآن کے ضمن میں جب سورۂ زمر پر گہرے غور و تدبر کے مرحلے پر پہنچا تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ اس سورۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے حکم کے ساتھ ''مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ'' کی اضافی شرط کا بار بار ذکر بہت معنی خیز ہے چنانچہ یہاں توحید عملی کا یہ تقاضا سامنے آتا ہے کہ **"لا معبودَ الا اللّٰہ"** ــــ **"لا مقصودَ الا اللّٰہ"** ــــ **"لامطلوبَ الا اللّٰہ"** اور **"لا محبوبَ الا اللّٰہ"** کے ساتھ ساتھ توحید فی الاطاعت پر زور دیا گیا ہے جسے حدیث نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ''**لا طاعۃَ لمخلوقٍ فی معصیۃِ الخالق**'' سے تعبیر کیا گیا ہے ــــ پھر اس سے اگلی سورت یعنی سورۂ مومن یا سورۂ غافر میں ''دعا'' کے حکم کے ساتھ بھی' جو احادیثِ نبویہ' کی رو سے ''مُخُّ الْعِبَادۃ'' بھی ہے اور ''ھُوَ الْعِبَادۃ'' بھی ''**مُخْلِصِین لہ الدِّین**'' کی اضافی قید بہت معنی خیز ہے۔ اس سے اگلی سورت میں اللہ سے دعا سے آگے بڑھ کر خلق خدا کو ''دعوت'' کے ضمن میں بھی ''دعوت الی سبیل الرّبّ'' (سورۂ نحل) کی بجائے ''دعوت الی اللہ'' کے الفاظ نہایت اہم ہیں ــــ اور اس طرح توحید عملی کا یہ مضمون درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے سورۂ شوریٰ میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جاتا ہے' یعنی ''اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ''

گویا توحید عملی کی آخری منزل یہ ہے کہ وہ اجتماعی نظام یا جدید اصطلاح میں ریاست قائم کردی جائے جس میں حاکم مطلق اور شارع حقیقی اللہ کے سوا کوئی نہ رہے ــــــ!

اپنے ان تاثرات کو راقم نے چند دروس و خطابات کے ذریعے بیان کیا جسے میرے بزرگ رفیق شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم و مغفور نے ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کی شدید مشقت برداشت کر کے مارچ ۱۹۸۵ء میں ''توحید عملی'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا ــــــ جسے اب اٹھارہ سال بعد از سرِ نو ایڈٹ کر کے شائع کیا جا رہا ہے ــــــ اس ضمن میں جو بھی خیر اب تک وجود میں آیا ہو یا آئندہ آئے' اس کے اجر و ثواب میں ظاہر ہے کہ میرے ساتھ ساتھ ان سب لوگوں کا بھی حصہ ہے جنہوں نے اس کی اشاعت کے ضمن میں محنت کی ہے!

الحمد للہ اس سے بھی بہت قبل میں ''حقیقت و اَقسامِ شرک'' پر ایک ایک گھنٹے کی چھ تقاریر کر چکا ہوں جن سے شرک کی ہمہ گیری ــــــ اور خصوصاً عہد حاضر کے مخصوص شرک پوری وضاحت سے سامنے آتے ہیں۔ ان تقاریر کے کیسٹ تو بہت پھیلے ہیں اور مقبول عام بھی ہوئے ہیں ــــــ لیکن ان کو بھی کیسٹ کی ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے اور مرتب کر کے شائع کرنے کا مرحلہ تا حال نہیں آیا۔ دیکھئے کب اس کی صورت من جانب اللہ پیدا ہوتی ہے۔

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

۱۹ اگست ۲۰۰۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

(برطبع اوّل)

از شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم

الحمد للہ ربّ العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علی خیر

خلقہ محمدٍ الامین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

محترم ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی ۷؍دسمبر سے ۱۹؍دسمبر ۱۹۸۳ء تک خطابات' درسِ قرآن حکیم اور تنظیم اسلامی کے ایک تربیتی پروگرام کے ضمن میں کراچی میں مقیم رہے۔ اس دوران شریف آباد فیڈرل بی ایریا عقب الاعظم اسکوائر میں امیرِ موصوف نے ۱۳ تا ۱۵؍دسمبر ۱۹۸۳ء کو بعد نماز عشاء علاقہ کی وسیع وعریض مسجد' جامع مسجد الصفا میں پہلے دن ایک عمومی خطاب فرمایا اور بقیہ دو دن سورۃ الشوریٰ کے بعض مقامات کا درس دیا اور اس امر کو واضح فرمایا کہ فریضۂ اقامت دین' توحید فی العلم اور توحید فی العمل کا ذروۂ سنام (چوٹی) ہے۔ اس خطاب میں یہ مضمون سورۃ الزمر' سورۃ المؤمن' سورۃ حٰمٓ السجدۃ سے سورۃ الشوریٰ کی طرف بتدریج آگے بڑھتا ہے۔ فریضۂ اقامت دین کے موضوع پر امیر محترم کے متعدد خطابات اور دروس ہو چکے ہیں۔ لیکن اس عاجز کے خیال میں اس موضوع پر موصوف کا یہ خطاب اور درس چوٹی کا درجہ رکھتا ہے اور بالکل نئے اسلوب سے دیا گیا ہے' طرزِ استدلال بھی نیا ہے۔

لہٰذا اس عاجز نے کیسٹ سے نقل کر کے اس خطاب اور پہلے درس کو معمولی حک و اضافہ اور ذیلی وضمنی سرخیوں کے ساتھ ماہنامہ ''میثاق'' میں سات اقساط میں شائع کیا اور اب اللہ تعالیٰ کی توفیق' نصرت اور تائید کے طفیل سے خطاب اور دونوں دروس کو کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ وَمَا توفیقی الاّ باللّٰہ!

اس خطاب اور دروس میں جہاں اقامت دین کی فرضیت واضح اور مبرہن ہو کر

سامنے آتی ہے وہاں اس عظیم ترین فرض کی ادائیگی کے لئے جو تنظیم قائم ہو اُس کے رفقاء میں جو اوصاف اور خصائص مطلوب ہیں وہ بھی بڑی وضاحت وصراحت کے ساتھ سامنے آ جاتے ہیں' جن کو اپنے اندر پیدا کرنے کی شعوری کوشش کرنا ہر اُس رفیق پر لازم ولا بدمنہ ہے جو تنظیم سے وابستہ ہے۔

اس خطاب اوران دروس پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دام اقبالہ حسب دستور نظر ثانی نہ فرما سکے' البتہ اس مرتبہ موصوف کے فرزند ارجمند عزیزم ڈاکٹر عارف رشید سلمہ فیلو قرآن اکیڈمی نے نظر ثانی بھی کی ہے اور بڑی عرق ریزی کے ساتھ کتابت کی تصحیح بھی کی ہے۔ جزاہُ اللہ خیرًا واحسن الجزاء۔

جیسا کہ متعدد بار عرض کیا جا چکا ہے کہ خطاب اور درس کو تحریری شکل دینا کافی مشکل کام ہے۔ انتہائی احتیاط کے باوصف ڈاکٹر صاحب کے مدعا کو تحریری صورت دینے میں زبان وانشاء کی تقصیر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے۔

امیر محترم نے اسی موضوع پر ۱۵ر ستمبر ۱۹۸۴ء کو عالی مسجد نواں کوٹ ملتان روڈ' لاہور میں جمعیت اشاعت التوحید والسنۃ کے چالیسویں سالانہ اجلاس میں بھی خطاب فرمایا تھا۔ اس اجلاس میں جمعیت کے امیر محترم حضرت مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری دامت برکاتہم بھی بنفسِ نفیس شریک تھے۔ شاہ صاحب دامت برکاتہم دعوت توحید اور مشرکانہ ومبتدعانہ اوہام' عقائد اور افعال کی تردید وابطال کے ضمن میں ملک گیر شہرت رکھتے ہیں۔ امیر محترم کے خطاب کے بعد شاہ صاحب قبلہ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا ان کو بجنسہٖ اور لفظ بلفظ کیسٹ سے منتقل کر کے صفحاتِ آئندہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اللّٰھم ثبت اقدامنا علٰی دینك' اللّٰھم ثبت اقدامنا علٰی طاعتك
اللّٰھم ارزقنا شھادۃً فی سبیلك ۔ آمین یا ربّ العالمین!

احقر جمیل الرحمٰن
۲۷ر فروری ۱۹۸۵ء

ارشادات

حضرت مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری (رحمۃ اللہ علیہ)

امیر جمعیت اشاعت التوحید والسنۃ

حضرت شاہ صاحبؒ نے خطبہ مسنونہ کے بعد سورۂ رعد کی حسب ذیل آیات کی تلاوت فرمائی:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ..... بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۗءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۭ وَمَا دُعَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ﴾

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب قبلہ نے اپنے موضوع ''توحید فی الحقیقت کیا ہے؟'' پر گفتگو سے قبل بطور تمہید فرمایا:

''بزرگو! بھائیو! عزیزو! ہمارے محترم ومکرم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ماشاء اللہ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ' اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جس خوبی' اخلاص اور سوز اور دردِ دل سے توحید فی العمل یا توحید فی الطلب کو مفصل اور پورے اجزاء کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور پھر الحمد للہ کتاب وسنت کے پورے حوالے سے اور صحیح تشریح سے آپ حضرات تک فصل الخطاب کے ساتھ پیغامِ حق پہنچایا ہے' اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسے قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میرا یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے جناب محترم کی تقریر سنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے۔ اللہ تعالیٰ دینِ حق پر' دینِ قیم پر' دینِ خالص پر جناب مکرم کو استقامت اور اخلاص کی نعمت نصیب فرمائے اور جس ولولے' جس جذبے' جس محنت کے ساتھ یہ رضائے الٰہی کو مقصود بنائے ہوئے دعوتِ حق کا کام کر رہے ہیں' تبلیغ کا حق ادا کر رہے ہیں' جس کی وجہ سے اپنوں کی بھی باتیں سن رہے

ہیں' غیروں کے طعن و تشنیع بھی برداشت کر رہے ہیں' اس کام میں وقتاً فوقتاً جو تکالیف اٹھاتے اور جھیلتے ہیں وہ ان کے لئے توشۂ آخرت بنائے' اور اللہ تعالیٰ اس دعوت کو کامیاب فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو توفیق دے اور اپنے فضل و رحمت سے ہماری قسمت میں یہ سعادت عطا فرما دے کہ' اللہ اللہ' جس طرح ڈاکٹر صاحب دل و جان سے کوشش کر رہے ہیں کہ دین توحید اجتماعی رنگ میں غالب اور نافذ ہو جائے' دین پورا کا پورا قائم ہو' اسی طرح ہم بھی اس کام میں لگ جائیں۔ ان کی تو کوشش ہے' محنت ہے' ان کے ساتھیوں کی محنت ہے اور کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب فرمائے۔ یہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ البتہ ہمیں وہ سب کچھ کرنا چاہئے جو ہم سے بن سکے۔ اس کے مصداق تو ہم بنیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور اس کی قدرت کاملہ سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کامیابی عطا فرما دے۔ اس کے ہاتھ میں ہے کہ ﴿كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۞﴾ صبر و استقامت اسی طرح جاری رہا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کوئی بعید نہیں کہ وہ کامیابی عطا فرما دے۔ ورنہ ایک مسلمان کہلانے والے کا جو فریضہ ہے اس کے لئے تو ماشاء اللہ ڈاکٹر صاحب نے تن من کی بازی لگائی ہوئی ہے۔

یہ محض رسمی الفاظ نہیں بلکہ میرا حقیقی تاثر ہے کہ مجھے ان کی تقریر سن کر الحمد للہ ثم الحمد للہ سب سے بڑی خوشی' سب سے بڑی راحت اور سب سے بڑا اطمینان دل کو ہوا کہ یا اللہ اس دور میں تو نے اپنے فضل و کرم سے کسی کو تو یہ توفیق بخش دی ہے کہ وہ تیرے دین خالص کے لئے' دین حق کے لئے' اجتماعی طور پر اسے کامیاب بنانے کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ اے اللہ! تو اس کو بارآور فرما ——— مایوسی کے حالات تو ہوں گے۔ لیکن ﴿وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۞﴾ اللہ کی رحمت سے مایوسی گمراہی اور کفر ہے۔ ﴿وَلَا تَايْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۗ اِنَّهٗ لَا يَايْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۞﴾ اللہ کی رحمت سے صرف کافر لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں۔ باقی کچھ لوگ بعض اوقات کہہ دیتے ہیں کہ موجودہ معاشرے میں اس کام کی کامیابی مشکوک ہے۔ یہ خیال ہی سرے سے غلط ہے۔ دنیا میں کامیابی ہو یا نہ

ہو لیکن اللہ کے نزدیک کرنے کا کام یہی ہے۔ میں کون اور ڈاکٹر صاحب کون!
نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن انبیاء (علیہم السلام) میں سے بعض
نبی جن کی صداقت پر' جن کی دیانت پر' جن کی امانت پر' جن کی محنت پر' جن کی
دعوت پر' جن کے اخلاص پر' جن کی استقامت پر' جن کی قربانیوں اور ایثار پر کسی
کو اعتراض کا موقع نہیں مل سکا' تو اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی پاکؐ نے فرمایا کہ
ان میں سے کسی کے ساتھ دو اور کسی کے ساتھ ایک اُمتی ہوگا جنہوں نے دعوت
کو پوری طرح قبول کیا ہوگا اور کسی کے ساتھ ایک بھی نہیں۔

یہ تو حدیث ہے اور صحیح ہے۔ اللہ اللہ' قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے
حضرت نوح علیہ السلام کا شکوہ نقل فرمایا ہے: ﴿رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا
وَّنَهَارًا ۞﴾ اے میرے مالک' اے میرے آقا اور مختار! میں نے خالص توحید
اور صرف تیری عبادت کی دعوت دی اور اس کام کے لئے میں نے نہ رات
چھوڑی نہ دن چھوڑا۔ لیکن نتیجہ! ﴿فَلَمۡ یَزِدۡهُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا ۞﴾ یہ
میری دعوت سن کر راتوں کو بھی بھاگ کھڑے ہوتے اور دن کو بھی۔ آگے آیا
کہ ﴿ثُمَّ اِنِّیۡۤ اَعۡلَنۡتُ لَهُمۡ وَاَسۡرَرۡتُ لَهُمۡ اِسۡرَارًا ۞﴾ میں نے مجلسوں میں
اعلانیہ بھی دعوت دی —— جیسے ڈاکٹر صاحب نے آپ حضرات کے سامنے
دعوت پیش کی —— اور میں نے پوشیدہ ایک ایک کے پاس جا کر بھی دعوت دی'
تاکہ مجلس میں بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو اس طرح آ جائے۔ الغرض دعوت
پہنچانے میں مَیں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ نہ رات چھوڑی نہ دن چھوڑا' نہ
اعلان چھوڑا نہ اسرار چھوڑا' اپنا تمام آرام تج دیا —— ڈاکٹر صاحب محترم کا نام
بھی آ گیا —— لیکن ان کی ساڑھے نو سو سال کی دعوت پر کتنے لوگ ایمان
لائے! کتنے لوگوں نے اسے قبول کیا! اللہ تعالیٰ کی شہادت ہے کہ نوح علیہ السلام
کے اخلاص میں' ان کی استقامت میں' ان کے ایثار میں' ان کی صداقت میں'
ان کی شجاعت میں نہ کمی تھی نہ کسی کو شک تھا۔ لیکن اللہ کی شہادت سن لو کہ اس
سب کا نتیجہ کیا نکلا! ﴿وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ ۞﴾ ''بہت ہی تھوڑے آدمی ان
پر ایمان لائے''۔ انہوں نے اللہ کے حکم سے جو کشتی بنائی وہ کتنی بڑی ہو گی!
آپ خود تصور کر لیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ کل اسی (۸۰) افراد تھے۔

ذرا سوچو کہ ساڑھے نوسو برس کی دعوت کا نتیجہ یہ تھا۔ اگر فی برس ایک آدمی بھی دعوت قبول کرتا تو ساڑھے نوسو تو آتے۔ چلو دس دس برس میں ایک آدمی آتا تو بھی پچانوے (۹۵) تو ہوتے۔ لیکن بعض روایات میں اسی (۸۰) سے بھی کم تعداد آئی ہے' کلھم چالیس (۴۰) افراد۔ ایک اور روایت بھی ہے جس میں نو افراد کی تعداد بیان ہوئی ہے۔

اللہ اللہ' کام کرنے والا یہ نہ سوچے کہ میرے ساتھ لوگ آتے ہیں یا نہیں آتے۔ دیکھنے والے بھی یہ نہ سوچیں کہ اس کے ساتھ فلاں بزرگ ملے یا نہیں ملے۔ یہ دیکھو کہ کام صحیح ہے' کتاب وسنت کے مطابق ہے' اللہ تعالیٰ کے قرآن کے مطابق ہے' نبی اکرم ﷺ کے ارشاداتِ گرامی کے مطابق ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد! پھر قبول کرنا چاہئے۔ زیادہ لوگ ہوں یا نہ ہوں۔ اس میں اعلیٰ قسم کے لوگ ہوں یا نہ ہوں۔ وہ معاملہ نہ ہو جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے آنجنابؑ کے ساتھ کیا تھا: ﴿وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِىَ الرَّاْىِ ۚ﴾ "(اے نوح!) ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے سردار لوگ' بڑے بڑے ذہین لوگ' بڑے بڑے باوجاہت لوگ' وہ تو تیرے ساتھ آئے نہیں۔ ہماری قوم کے کچھ ادنیٰ لوگ' کم عقل اور بے وقوف لوگ ہیں جو تیرے پیچھے لگ گئے ہیں۔ اللہ اللہ! میں آپ لوگوں کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ ڈاکٹر صاحب کی دعوت کا ساتھ دیں۔ اس میں ہماری دنیا اور عاقبت کی بھلائی ہے"۔

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ۔ اَمَّا بَعْدُ!

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم   بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ
وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا
تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ
يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ؀ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا
مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ
رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا
الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ؀ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ
وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ
اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا
وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ
اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ؀ وَالَّذِيْنَ يُحَاۗجُّوْنَ فِي اللّٰهِ
مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ
غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ؀ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ
وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ؀ يَسْتَعْجِلُ بِهَا
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَيَعْلَمُوْنَ
اَنَّهَا الْحَقُّ ۭ اَلَآ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ
بَعِيْدٍ؀ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ

الْعَزِيْزُ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ
كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَمَالَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ
نَّصِيْبٍ۝ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَالَمْ يَاْذَنْ بِهِ
اللّٰهُ ۭ وَلَوْ لَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِیَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ ﴾ (الشوریٰ : ۱۳-۲۱)

حضرات و خواتین! ان نشستوں میں ہم سورۃ الشوریٰ کے بعض منتخب مقامات کا مطالعہ کریں گے۔ میرے حقیر مطالعہ کی رو سے یہ سورۂ مبارکہ اقامت دین کے خاص موضوع پر چوٹی کا درجہ رکھتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے بعض سورتوں کے لئے ذروۂ سنام کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی مختلف سورتیں مختلف موضوعات پر چوٹی کے مقام کی حامل ہیں۔ انگریزی میں اسے ان موضوع کے Climax یعنی نقطۂ عروج سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میرے نزدیک اقامتِ دین کے خاص موضوع پر اس سورۂ مبارکہ کو ذروۂ سنام کا مقام حاصل ہے۔

مُصحف کی ترتیب

میں چاہتا ہوں کہ سورۃ الشوریٰ کے پیش نظر مقامات کے درس سے قبل اس سورۃ کے بارے میں اور قرآن کی موجودہ ترتیب کے متعلق بعض اہم اور بنیادی باتیں آپ کے گوش گزار کر دوں' جو ان شاء اللہ العزیز قرآن حکیم کے مطالعہ اور اس میں غور و فکر اور تدبر کے لئے قرآن مجید کے ہر طالب علم اور قاری کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔

مکّی اور مدنی سورتیں

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ سورۃ الشوریٰ مکّی سورۃ ہے۔ آپ اس بات سے

بھی واقف ہوں گے کہ قرآن مجید کا تقریباً دو تہائی حصّہ مکّی سورتوں پر اور بقیہ تقریباً ایک تہائی حصّہ مدنی سورتوں پر مشتمل ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قرآن مجید میں پہلے مکی اور بعد میں مدنی سورتیں یکجا جمع کر دی گئی ہوں۔ پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ مکیات اور مدنیات میں جو نزولی ترتیب ہے اس کے اعتبار سے قرآن حکیم کو مرتب کیا گیا ہو۔ یہ بات قرآن مجید کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ مصحف کی ترتیب نزولی ترتیب سے مختلف ہے۔

ازلی وابدی ترتیب

البتہ یہ بات جان لیجئے کہ اصل میں قرآن حکیم کی ازلی وابدی ترتیب یہی ہے جو مصحف کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ یہی ترتیب توقیفی ہے اور قرآن مجید کی یہی ترتیب لوحِ محفوظ کے مطابق ہے۔ البتہ نبی اکرم ﷺ پر قرآن مجید کا جو نزول ہوا ہے وہ ایک دوسری ترتیب سے ہوا ہے۔ یہ ان خاص حالات کے مطابق ہوا ہے جو آنحضور ﷺ کی دعوت اور آپؐ کی جِدّوجُہد کے دوران آپؐ کو مختلف مواقع پر مختلف مراحل میں پیش آئے۔ لہٰذا ترتیب نزولی کا تعلق خاص حالات سے اور خاص زمانے سے ہے۔ گویا خاص زمان ومکان اس نزول کے پس منظر میں ہیں۔ لیکن جس ترتیب سے قرآن مجید نبی اکرم ﷺ امت کو عطا فرما کر دنیا سے تشریف لے گئے ہیں وہ لوحِ محفوظ کی ترتیب کے عین مطابق ہے' اور یہ ہے ازلی وابدی ترتیب —— اسی کے مطابق آنحضور ﷺ کی وفات سے قبل کے رمضان المبارک میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو دوبار قرآن مجید کا دَور کرایا تھا۔

قرآن مجید کا نظم

قرآن فہمی اور خاص طور پر اس میں تدبر کے لئے مصحف کی موجودہ ترتیب' اس کے نظم اور سورتوں کے باہمی ربط و تعلق کو سمجھنا بہت اہم ہے۔ چنانچہ اس پر ہر دَور میں کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے قرآن مجید اور اس کی سورتوں

کا جو اندرونی نظام اور ان کا جو باہمی ربط و تعلق ہے' اس پر برعظیم پاک و ہند کی ماضی قریب کی ایک شخصیت نے نہایت عمیق تدبر اور تفکر کیا ہے اور اس نظام اور باہمی ربط و تعلق کو واضح کرنے کے لئے انتہائی قابل قدر کام کیا ہے۔ یہ شخصیت تھے مولانا امام حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ جن کا انتقال ۱۹۳۰ء میں ہوا۔ مولانا فراہی علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے بہت قریبی عزیز تھے۔ ان دونوں کے مابین ماموں زاد اور پھوپھی زاد بھائیوں کا رشتہ تھا۔ مولانا فراہیؒ نے عربی زبان میں قرآن مجید کے چند اجزاء کی تفسیر بھی لکھی تھی اور اس کا نام ہی مولانا مرحوم نے "تفسیر نظام القرآن" تجویز کیا تھا۔ اس کا مقدمہ مولانا نے "مقدمہ تفسیر نظام القرآن" کے عنوان سے تحریر کیا تھا جو نہایت اہمیت کا حامل اور میرے نزدیک قرآن فہمی کے لئے بمنزلہ کلید ہے۔

نظام کے لحاظ سے قرآن کے گروپ

مولانا فراہیؒ کے اصولوں پر نظامِ قرآن کو واضح کرنے کے لئے ان ہی کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اس ضمن میں ایک رائے ظاہر کی جو خاصی وزنی ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ قرآن حکیم کی جملہ سورتیں سات گروپوں میں منقسم ہیں اور ہر گروپ کی تشکیل اس طرح ہے کہ اس کے آغاز میں ایک یا ایک سے زائد مکی سورتیں ہیں اور ہر گروپ کا اختتام ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پر ہوتا ہے۔ اس طرح مکیات اور مدنیات مل کر ایک گروپ بن جاتا ہے۔ پھر مکیات اور مدنیات پر مشتمل دوسرا گروپ مکمل ہوتا ہے۔ وَقِس عَلٰی ذٰلِكَ ـــــ اس طرح قرآن حکیم کے جو سات گروپ بنتے ہیں ان میں سے ہر گروپ کا ایک اپنا مرکزی مضمون ہوتا ہے' جسے وہ "عمود" کہتے ہیں۔ عمود کی اصطلاح شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اختیار فرمائی ہے۔ لیکن یہ کہ قرآن حکیم کے سات گروپ ہیں اور ہر گروپ کا اپنا ایک عمود یعنی مرکزی مضمون ہے' یہ مولانا اصلاحی کی اپنی تحقیق اور تدبر کا نتیجہ ہے جو اس دور میں ہمارے سامنے آیا ہے۔

مولانا اصلاحی کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ہر گروپ کے مرکزی مضمون یا عمود کے دو رُخ ہیں ــــــ (جیسے ہم کہتے ہیں تصویر کے دو رُخ) ــــــ ایک رُخ مکیات میں بیان ہوتا ہے اور دوسرا رُخ مدنیات میں۔ اور اس طرح یہ دونوں رُخ مل کر اس گروپ کے عمود یا مرکزی مضمون کی تکمیل کر دیتے ہیں۔

اس طرح جو سات گروپ بنتے ہیں ان میں سے پہلے گروپ میں مکی سورۃ صرف ایک ہے اور وہ ہے سورۃ الفاتحہ۔ یہ سورۃ مختصر ہے اور صرف سات آیات پر مشتمل ہے' اگرچہ اپنے مضامین کی جامعیت کے اعتبار سے اسے "قرآن عظیم" بھی کہا گیا ہے۔ گویا یہ سورۃ خود اپنی جگہ ایک مکمل قرآن ہے۔ اسے اُمّ القرآن بھی کہا گیا ہے اور اساس القرآن بھی۔ اس کو شافیہ اور کافیہ کے ناموں سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ اس سورۃ کے مختلف نام اس کی جامعیت و عظمت کے اظہار کے لئے رکھے گئے ہیں' حالانکہ حجم کے اعتبار سے یہ بہت چھوٹی سورۃ ہے۔ جبکہ اس پہلے گروپ میں چار نہایت طویل مدنیات شامل ہیں' یعنی سورۃ البقرۃ' سورۂ آل عمران' سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ۔ گویا قرآن مجید کے تقریباً چھ پارے ان چار سورتوں پر مشتمل ہیں۔

دوسرے گروپ میں دو بڑی مکی سورتیں الانعام اور الاعراف اور اسی طرح دو بڑی مدنی سورتیں الانفال اور التوبۃ شامل ہیں۔

تیسرے گروپ میں پہلی چودہ سورتیں سورۂ یونس سے سورۃ المؤمنون تک مکی ہیں اور آخر میں صرف ایک مدنی سورۃ "سورۃ النور" شامل ہے۔ یہ گروپ بھی چھ پاروں کے لگ بھگ بنتا ہے۔

چوتھا گروپ سورۃ الفرقان سے شروع ہو کر سورۃ الاحزاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں بھی ابتداء میں آٹھ مکی سورتیں اور آخر میں صرف ایک مدنی سورۃ سورۃ الاحزاب ہے۔

پانچواں گروپ سورۂ سبا سے شروع ہو کر سورۃ الحُجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ابتداء میں تیرہ مکی سورتیں اور اختتام پر تین مدنی سورتیں شامل ہیں۔

پھر چھٹا گروپ سورۂ ق سے شروع ہو کر سورۃ التحریم پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں پہلی سات سورتیں مکّی اور اس کے بعد سورۃ الحدید سے لے کر سورۃ التحریم تک دس سورتیں مدنی ہیں۔ یہ وہ واحد گروپ ہے جس میں مدنیات کی تعداد مکّیات سے زیادہ ہے۔

آگے چلئے' پھر سورۃ الملک سے سورۃ الناس تک ساتواں گروپ ہے۔ اس گروپ میں چند سورتیں مستثنیٰ ہیں جو مدنی ہیں' باقی کل کی کل سورتیں مکیات پر مشتمل ہیں۔

مکّی سورتوں کے مرکزی مضامین و موضوعات

اب ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ مکی سورتوں کے مرکزی مضامین و موضوعات کیا ہیں؟

ا) ایمانیاتِ ثلاثہ : مکی سورتوں کا اصل موضوع ایمان ہے۔ پہلے اسی کو پختہ کیا گیا ہے' اس لئے کہ ایمان پر ہی اسلام کا دارومدار ہے۔ ایمان کی حیثیت جڑ کی ہے اور اسلام کی حیثیت درخت کی ہے' جبکہ اعمالِ صالحہ اسی ایمان اور اسلام کے ثمرات ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بنیادی حیثیت جڑ ہی کو حاصل ہوتی ہے جس پر درخت قائم ہوتا اور برگ وبار لاتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ جیسے ایک عمارت ہے' اس کی ایک بنیاد ہے اور اس پر تعمیر ہے۔ نظر تو عمارت آتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس عمارت کے استحکام کا سارا دارومدار بنیاد پر ہے اور وہ زیر زمین ہے' نظر نہیں آتی ــــــ پس معلوم ہوا کہ اصل شے ایمان ہے۔ یہ ایمان ہی اصل موضوع ہے تمام مکی سورتوں کا۔

البتہ ایمان کے تین اجزاء ہیں۔ ایمان باللہ یا توحید' ایمان بالرسالت اور ایمان بالمعاد یا ایمان بالآخرۃ ــــــ ان تینوں اجزاء کی مکی سورتوں میں مختلف اسالیب سے دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تفہیم ہے۔

ب) بنیادی اخلاقیات : مکی سورتوں کا دوسرا بڑا اور اہم مضمون بنیادی

اخلاقیات سے متعلق ہے۔ یعنی سچائی ' ہمدردی ' بھوکوں کو کھانا کھلانا ' یتیموں سے حسنِ سلوک ' حاجت مندوں کی دست گیری ' ماپ اور تول میں دیانت ' معاملات میں امانت ' ایفائے عہد ' صلہ رحمی ' والدین سے حسنِ سلوک ' زنا سے اجتناب ' عصمت و عفت کی حفاظت ' تبذیر و اسراف سے بچنا ' چغل خوری ' بہتان تراشی ' شیخی و تکبر اور تفاخر و تکاثر سے پرہیز ' قتل ناحق بالخصوص نومولود بچیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے پر نکیر ' غلاموں پر شفقت یا ان کی آزادی کی ترغیب وغیرہ وغیرہ۔ مکی سورتوں میں ان اخلاقیات کی تعلیم و تلقین بھی کثرت سے اور پورے شدّومد کے ساتھ مختلف اسالیب میں ملتی ہے۔ مکی سورتوں میں ان چیزوں پر آپ کو زور (Emphasis) ملے گا ـــــ ان میں آپ کو شریعت کے احکام نہیں ملیں گے کہ حلال و حرام کیا ہے! ان کا ذکر مدنی سورتوں میں آئے گا ـــــ مکیّات میں ایمان کی دعوت کے ساتھ ساتھ بنیادی اخلاقیات کی تعلیم و تلقین بھی ملے گی ' ان اخلاقیات کی جو مکہ والوں کے نزدیک بھی متفق علیہ تھے۔ اور کوئی انسان بھی دنیا میں ایسا نہیں ہوگا جو یہ تسلیم نہ کرے کہ سچ بولنا اچھا ہے ' جھوٹ بولنا برا ہے۔ اور کوئی انسان ایسا نہیں ہوگا جو یہ نہ کہے کہ وعدہ وفا کرنا اچھائی ہے اور وعدہ خلافی برائی ہے۔ وقِس علٰی ھذا۔

ج) <u>قصص الانبیاء وانباء الرُّسل</u> : تیسرا بڑا مضمون جو مکی سورتوں میں ہے وہ انبیاء و رُسل کے حالات و واقعات ہیں۔ تاہم ان میں بھی ایک فرق ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے جو واقعات و حالات بیان ہوئے ہیں وہ بنیادی اخلاقیات کے ذیل میں آئے ہیں ' جبکہ رسولوں کے واقعات و حالات اس کام کے لئے آئے ہیں جس کو امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے "اَلتَّذْکِیْرُ بِاَیَّامِ اللّٰہِ" کا عنوان دیا ہے ' یعنی یاددہانی کرانا اللہ کے دنوں کے حوالے سے۔ گویا جن قوموں کی طرف اللہ کے رسول مبعوث ہوئے اور ان قوموں نے ان رسولوں کی دعوتِ توحید کو قبول نہیں کیا ' اسے رد کر دیا ' تو وہ قومیں ہلاک کر دی گئیں ' نسیاً منسیاً کر دی گئیں ' ان کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ جیسے قومِ نوح ' قومِ ثمود ' قومِ عاد ' قومِ لوط ' قومِ شعیب اور آلِ فرعون وغیرہ ـــــ

ان چھ اقوام کا ذکر بار بار قرآن مجید میں آیا ہے۔ جو حضرات قرآن حکیم کو پڑھنے والے ہیں ان کو معلوم ہے کہ ان چھ رسولوں کا ذکر' جو ان قوموں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے' یعنی حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت لوط' حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام' مختلف اسالیب اور مختلف سیاق و سباق میں اس اعتبار سے تکرار و اعادہ کے ساتھ مکی سورتوں میں آتا ہے کہ ان کے حالات تمہارے لئے مثال و نشانِ عبرت ہیں' ان سے سبق لو کہ ان رسولوں کی قوموں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا تو وہ ہلاک کر دی گئیں۔ اگر تم نے بھی ان ہی کا سا رویہ اختیار کیا تو تم اس دنیا میں بھی عذابِ الٰہی سے دوچار ہو گے اور آخرت میں بھی عذابِ دائمی تمہارا مقدر ہو گا۔

جن حضرات کو مطالعۂ قرآن سے دلچسپی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر ان کے لئے دو اصطلاحات کا فرق بھی واضح کر دوں ——— ایک اصطلاح ہے "قصص النبیین" ——— نبیوں کے حالات کو قصص قرار دیا گیا ہے۔ رسولوں کے حالات کے لئے دوسری اصطلاح آتی ہے اور وہ ہے "انباء الرُّسل" ——— نبا بڑی اہم خبر کو کہتے ہیں۔ انباء الرُّسل کے معنی ہوں گے رسولوں کی بہت اہم خبریں ——— یعنی پوری پوری قوموں کا ہلاک کر دیا جانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا' جن کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے : ﴿ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ﴾ وہ ایسے ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں' کبھی بستے ہی نہیں تھے ——— ﴿ لَا يُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ﴾ اب ان کے مسکن رہ گئے ہیں' کھنڈرات ہیں' ان میں بسنے والے کہیں نظر نہیں آتے ——— کہیں فرمایا : ﴿ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ﴾ یعنی ان ظالم قوموں کی جڑ کاٹ دی گئی۔ یہاں یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ قرآن میں "ظلم" کا لفظ عموماً شرک کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جیسے : ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾

معلوم ہوا کہ یہ بڑے اہم واقعات ہیں۔ تو ان کو قرآن انباء الرُّسل کہتا ہے اور جن انبیاء کرام کے واقعات و حالات میں ان قوموں کی ہلاکت کا ذکر نہیں ہے'

بلکہ ان نبیوں کے مضبوط کردار' ان کی پاکیزہ سیرت' ان کی صداقت و دیانت' ان کی امانت' ان کی عصمت' ان کی عفت اور ان کے صبر و ثبات کا ذکر ہے' جیسے حضرت یوسف اور حضرت یعقوب علیہما السلام کے واقعات و حالات سورۂ یوسف میں بیان ہوئے ہیں' تو ان کو قرآن قصص کہتا ہے ـــــ سورۂ یوسف میں الفاظ مبارکہ ہیں :

﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ﴾

"(اے نبیؐ!) ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایہ میں واقعات اور حقائق تم سے بیان کرتے ہیں"۔

اور سورۂ ہود کے آخر میں آتا ہے:

﴿ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاۗءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

"یہ انباء الرّسل ہیں جو ہم (اے نبیؐ!) آپؐ کو سنا رہے ہیں' تاکہ اس کے ذریعے سے ہم آپؐ کے دل کو جما دیں اور تسلی دیں۔ اور (اے نبیؐ!) اس سورۃ میں آپؐ کے پاس حق آیا ہے اور اس میں نصیحت اور یاددہانی ہے ایمان والوں کے لئے"۔

یعنی جن حالات سے اے نبیؐ! آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے وہی حالات سابقہ رسولوں کو بھی پیش آئے تھے' لیکن بالآخر اللہ کی نصرت ان رسولوں کے شامل حال ہوئی' وہ سربلند ہوئے اور وہ قومیں جنہوں نے ان کی تکذیب کی' ان کا استہزاء کیا' تمسخر کیا' ان کی دعوت ایمان سے اعراض کیا وہ ہلاک و برباد کر دی گئیں۔

میں نے جن تین اہم مضامین کا ذکر کیا ہے کہ اکثر و بیشتر مکی سورتوں میں مشترک ہیں' ان کا اعادہ کر لیجئے۔ (۱) دعوتِ ایمان۔ ایمان میں توحید' رسالت اور آخرت۔ (۲) بنیادی اخلاقیات کی تعلیم و تلقین۔ (۳) قصص النبیّین' جن کا تعلق بنیادی

اخلاقیات سے ہے اور انباء الرُّسل جن کا تعلق دعوتِ ایمان سے ہے۔ یہ ہیں مکّی سورتوں کے بنیادی مضامین۔

گروپوں میں مضامین کی تقسیم

مضامین کی مذکورہ بالا تقسیم کے علاوہ ان میں ایک اور تقسیم بھی ہے۔ میں نے مکی سورتوں کے جو گروپ آپ کو گنوائے تھے ان میں سے پہلے گروپ میں مکی سورۃ صرف سورۃ الفاتحہ ہے' جو پورے قرآن کے لئے بمنزلہ دیباچہ اور مقدمہ ہے۔ اس کے بعد اس گروپ میں پانچ مدنی سورتیں ہیں۔ باقی رہ گئے چھ گروپ —— ان میں آپ دیکھیں گے کہ دوسرے اور تیسرے گروپ کی مکی سورتوں میں زیادہ زور ایمان بالرسالت پر ہے۔ یعنی سورۃ الانعام و سورۃ الاعراف جو دوسرے گروپ کی مکیات ہیں' ان میں اور تیسرے گروپ میں سورۃ یونس سے لے کر سورۃ المؤمنون تک —— اگرچہ جو تین بنیادی مضامین مَیں نے گنوائے ہیں وہ بھی ان مکی سورتوں میں ملیں گے' لیکن ان گروپوں کی سورتوں میں خاص زور (Emphasis) رسالت پر ملے گا۔ یعنی ان کا اصل عمود اور مرکزی مضمون رسالت ہے۔ اس کے بعد چوتھے گروپ میں سورۃ الفرقان سے لے کر سورۂ حم السجدۃ تک آٹھ اور پھر پانچویں گروپ میں سورۂ سبا سے لے کر سورۃ الاحقاف تک تیرہ مکی سورتیں ہیں۔ ان اکیس سورتوں کا مرکزی مضمون یا عمود توحید ہے۔ ان میں پہلے مضامین بھی موجود ہیں' لیکن اصل زور توحید پر ہے۔

آخری جو دو گروپ ہیں ان میں چھٹے گروپ میں مکیات سورۂ ق سے لے کر سورۃ الواقعۃ تک اور ساتویں گروپ یعنی سورۃ الملک سے جو مکیات کا طویل سلسلہ ہے اس میں چند سورتوں کو چھوڑ کر ان کا مرکزی مضمون یا عمود ہے آخرت کا انذار' آگاہ کرنا' خبردار کرنا کہ یہ دنیا فانی ہے' اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے' جس میں اس دنیا کی زندگی کے تمام اعمال ہی کا نہیں بلکہ نیتوں اور ارادوں کا بھی حساب

کتاب ہو گا' جواب دہی کرنی ہو گی' پھر عدالتِ الٰہی سے جزاو سزا کے فیصلے صادر ہوں گے' یا جنت ہو گی ہمیشہ کے لئے یا آگ ہو گی دائمی ـــــ ان دو ہی گروپوں میں یہ سورتیں ملتی ہیں : ﴿ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ○ لَیْسَ لِوَقْعَتِھَا کَاذِبَۃٌ ○ ﴾ کہیں فرمایا : ﴿ اَلْحَاقَّةُ ○ مَا الْحَاقَّةُ ○ ﴾ کہیں آگاہ کیا گیا : ﴿ اَلْقَارِعَةُ ○ مَا الْقَارِعَةُ ○ ﴾ اسی طرح سے : ﴿ عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ ○ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ ○ الَّذِیْ ھُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ○ ﴾ اور : ﴿ ھَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ ○ وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ○ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ○ تَصْلٰى نَارًا حَامِیَةً ○ تُسْقٰى مِنْ عَیْنٍ اٰنِیَةٍ ○ ﴾

تو آخری دو گروپوں کی مکیات میں زیادہ زور ہے انذارِ آخرت پر ـــــ درمیانی دو گروپوں کا مرکزی مضمون ہے توحید پر اور ابتدائی دو گروپوں کی مکیات میں جس پر زیادہ زور ہے' وہ ہے رسالت۔

اب آگے چلئے۔ مجھے اندازہ ہے کہ جن حضرات کو قرآن مجید کی ترتیب سے تعارف نہیں ہے ان کو یہ باتیں قدرے بھاری معلوم ہوں گی۔ لیکن میں اصل میں یہ تمہید بنا رہا ہوں اور آپ کو رفتہ رفتہ سورۃ الشوریٰ کی طرف لا رہا ہوں۔ میں نے ابھی جو درمیانی اکیس مکی سورتیں آپ کو گنوائیں ـــــ سورۃ الفرقان سے لے کر سورۃ حٰم السجدۃ تک آٹھ سورتیں اور سورۂ سبا سے لے کر سورۃ الاحقاف تک تیرہ سورتیں ـــــ ان دونوں گروپوں کی ان اکیس سورتوں میں درمیانی سورۃ کون سی ہو گی! ظاہر ہے کہ گیارہویں۔ تو گیارہویں سورۃ سورۂ یٰسٓ ہے' جس کو جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے قلب القرآن قرار دیا' تو سورۂ یٰسٓ قرآن کا دل ہے۔ اس لئے کہ قرآن کا اصل موضوع تو توحید ہی ہے۔ ہمارا دین' دینِ توحید ہے۔ رسالت بھی اسی لئے ہے کہ توحید کی طرف دنیا کو دعوت دے۔ آخرت کا انداز بھی اسی لئے ہے کہ لوگ شرک سے باز آجائیں' اس سے کلیتاً اجتناب کریں اور توحید کو اختیار کریں اور صرف اسی کا التزام کریں۔ اور سورۂ یٰسٓ میں یہ تینوں مضامین نہایت جامعیت' بلاغت اور ایجاز و اعجاز کے ساتھ آئے ہیں۔

دین کی اصل‘ اس کی جڑ‘ اس کی بنیاد توحید ہے اور اس کی رو سے
بڑی گمراہی شرک ہے۔ شرک وہ گناہ ہے جس کے بارے میں سورۃ النہ
مرتبہ فرمایا گیا : ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَ
اسی طرح توحید کے موضوع پر نہایت اہمیت کی حامل سورۃ البقرۃ میں آیۃ ا
جس کو آنحضور ﷺ نے قرآن کی تمام آیات کی سرتاج قرار دیا۔ پھر آخر
میں سورۃ الاخلاص ہے جس کو نبی اکرم ﷺ نے ایک ثلث قرآن کے م
دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ توحید کے موضوع پر آیتوں میں سے جامع
الکرسی ہے اور سورتوں میں سے جامع ترین سورۃ سورۃ الاخلاص ہے۔

توحید علمی اور توحید عملی

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے توحید کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو د
توحید‘ توحید فی المعرفۃ یا توحید فی العقیدۃ‘ یعنی اللہ کو ایک جاننا‘ اللہ کی ذا
کو شریک نہ ٹھہرانا‘ اللہ کی صفات میں کسی کو ساجھی قرار نہ دینا‘ کسی کو ا
ند‘ یا ہم پلّہ‘ ہمسر یا مدِّ مقابل نہ بنانا ــــــ چنانچہ توحید فی الذات اور توحید فی
ان دونوں کو جمع کریں گے تو یہ ہوگی علمی توحید‘ معرفت الٰہی کی توحید‘ ع
توحید۔ دوسری توحید ہے توحیدِ عملی۔ اس کو امام ابن تیمیہؒ نے توحید فی
جامع عنوان دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان فی الواقع ایک اللہ ہی کا بندہ بن جا
کی بندگی اور پرستش صرف اللہ ہی کے لئے خالص ہو جائے جو الاحد ہے۔
نبویؐ میں الفاظ آتے ہیں : ((وَحِّدُوا اللّٰهَ فَاِنَّ التَّوْحِيْدَ رَاْسُ الطَّاعَا
وَحِّدُوْا باب تفعیل سے صیغۂ امر ہے۔

”توحید“ اسی بابِ تفعیل سے مصدر ہے۔ اور تفعیل کا خاصّہ یہ
کام بڑی محنت سے ‘ بڑے اہتمام سے ‘ بڑے استقلال و استقرار سے کیا جا
اعلام کے معنی ہیں کسی کو کچھ بتا دینا اور تعلیم کے معنی ہیں کسی کو کچھ سکھا

بتانے اور سکھانے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آپ ایک دفعہ بتا کر فارغ ہو گئے' اب کوئی سمجھے یا نہ سمجھے' اس کے پلے کچھ پڑے یا نہ پڑے' آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ابلاغ کے معنی بھی صرف پہنچانے کے ہیں' لیکن تبلیغ کے معنی ہوں گے محنت سے' اہتمام سے' دلیل سے' تدریج سے کوئی بات کسی کو پہنچانا۔ چنانچہ تعلیم اور تبلیغ میں آپ کو سخت مشقت کرنی پڑتی ہے۔ ایک بات کو ذہن میں اتارنا مقصود ہے۔ تو اگر بات ایک مرتبہ سمجھ میں نہیں آئی تو اسے بار بار سمجھانا پڑے گا' اس کی توضیح کرنی ہو گی' تبیین کرنی پڑے گی' بڑی محنت سے کسی کے ذہن میں کوئی بات اتارنی اور بٹھانی ہو گی' اسے hammer کرنا پڑے گا۔ یہ تعلیم ہے۔ اسی طرح محنت اور لگن کے ساتھ دعوت پہنچانے سے تبلیغ کا حق ادا ہو گا۔ اس وضاحت سے اعلام و ابلاغ اور تعلیم و تبلیغ میں جو فرق ہے وہ سمجھا جا سکتا ہے۔

باب تفعیل کے خاصے کے متعلق ایک مثال اور دیکھئے۔ "انزال" کے معنی ہیں دفعتاً اتارنا۔ لیکن جب یہ لفظ بابِ تفعیل میں "تنزیل" بنے گا تو اس کے معنی ہوں گے تھوڑا تھوڑا کر کے' ٹھہر ٹھہر کر' تدریج سے اتارنا۔ پورا قرآن مجید رمضان میں لیلۃ القدر میں دفعتاً واحدۃً لوحِ محفوظ سے اتر کر سمائے دنیا تک آ گیا ——— یہ ہے انزال ——— ﴿ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۝ ﴾ اور ﴿ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰـرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنۡذِرِيۡنَ ۝ ﴾ اب سمائے دنیا سے آنحضور ﷺ پر جو نازل ہوا تو وہ بیک وقت نازل نہیں ہوا' بلکہ تنزیلاً نازل ہوا۔ ﴿ الٓمّٓ ۝ تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ ﴾ اور ﴿ وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ ﴾ سورۂ یٰس میں فرمایا : ﴿ تَنۡزِيۡلَ الۡعَزِيۡزِ الرَّحِيۡمِ ۝ ﴾ سورۃ الزمر شروع ہوتی ہے اسی تنزیل کے ذکر سے : ﴿ تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ۝ ﴾ سمائے دنیا تک قرآن کے نزول کی شان ہے شانِ انزالی اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے قلبِ مبارک پر نزولِ قرآن کی شان ہے شانِ تنزیلی۔ تھوڑا تھوڑا' ضرورت کے مطابق حالات و واقعات کی مناسبت سے قرآن کا نزول تنزیل ہے۔

توحید کیا ہے؟

باب تفعیل کے خاصے کو پیش نظر رکھ کر لفظ "توحید" پر غور کریں تو توحید کا مطلب و مفہوم ہوگا اللہ تبارک و تعالیٰ کو ذات و صفات کے لحاظ سے ایک ماننا اور جاننا۔ قارئین کو اندازہ ہوگا کہ توحید اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ دائمی طور پر اللہ کو ایک جان کر اور ایک مان کر استقلال و استقرار کے ساتھ اس کی پیہم اطاعت کے لئے محنت کرتے رہنا بڑا مشکل کام ہے۔ بقول شاعر ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

پس توحید کے لئے بڑی محنت و مشقت کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک لکیر کھنچی ہوئی تھی' پالا بنا ہوا تھا اور کوئی اُدھر سے اِدھر آگیا تو اسے توحید کی دولت مل گئی ـــــ اس طرح اسلام تو مل سکتا ہے' یعنی ایک شخص قانونی طور پر مسلمانوں میں شامل ہو جائے گا' لیکن یہ سمجھنا کہ وہ موحّد بن گیا' خام خیالی ہے۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ خطبے میں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ : وَحِّدُوا اللّٰہَ ـــــ یعنی اللہ کی توحید واقعتاً اختیار کرو جیسے کہ اس کا حق ہے۔

توحیدِ عملی

زندگی کے عملی میدان میں توحید اختیار کرنا توحیدِ علمی سے بھی زیادہ بڑا مشکل کام ہے۔ اس توحید فی العمل کو امام ابن تیمیہؒ توحید فی الطلب کہتے ہیں۔ یہ بڑی کٹھن وادی ہے جسے عبور کرنا بڑے عزم اور حوصلہ کا کام ہے ـــــ یہ توحید عملی درحقیقت پانچویں گروپ میں سورۂ سبا سے لے کر سورۃ الاحقاف تک کی تیرہ مکی سورتوں میں سے چار سورتوں کا مرکزی موضوع ہے۔ یہ چار سورتیں ہیں سورۃ الزمر، سورۃ المؤمن، سورۂ حم السجدۃ اور سورۃ الشوریٰ ـــــ ان چار سورتوں میں تدریجاً توحید عملی کا مضمون سامنے آتا ہے ـــــ جیسا کہ آئندہ صفحات میں ذکر ہو گا۔

توحید عملی کے مدارج

پہلا درجہ : انفرادی توحید

توحید عملی کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان کے انفرادی عمل میں توحید آ جائے اور انفرادی شخصیت فی الواقع توحید کے رنگ میں رنگی جائے۔ انسان واقعتاً اللہ کا بندہ بن جائے جیسا کہ اس کا بندہ بننے کا حق ہے، پھر اس کی بندگی میں کسی اور کی بندگی کا شائبہ نہ ہو۔ وہ بندگی خالص اللہ کی بندگی ہو ـــــ اگر اللہ کے سوا کسی اور کا کہنا مانا جا رہا ہو، اللہ کے حکم کے خلاف کسی اور کا حکم بجالایا جا رہا ہو تو یہ توحید نہیں ہے، بغاوت اور سرکشی ہے، طغیان ہے۔ لیکن اگر اللہ کے حکم کے تابع کسی کا حکم مانا جائے، اس سے آزاد ہو کر نہ مانا جائے، تو یہ توحید ہے۔ اس طرح اگر انسان اپنی انفرادی زندگی میں حقیقی طور پر اللہ کا بندہ بن جائے تو یہ عمل کے اعتبار سے انفرادی توحید ہے۔

اسی انفرادی عملی توحید کا ایک اہم پہلو توحید فی الدعا ہے ـــــ اس لئے کہ نبی

اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) "دعا ہی عبادت کا جوہر ہے"۔ ایک موقع پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا : ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) "دعا ہی اصل عبادت ہے"۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی حاجت روائی 'دست گیری اور اعانت و امداد کے لئے غیب میں سے جس کو پکارتا ہے وہی اس کا اصل معبود ہے۔ پس توحید فی العبادۃ اور توحید فی الدعاء' یہ انفرادی توحید کا پہلا درجہ ہے۔

دوسرا درجہ : اجتماعی توحید

اب انفرادی سطح اور انفرادی وجود سے جو توحید نکلے گی وہ لازماً متعدی ہو گی۔ جیسا کہ اگر کسی جگہ آگ ہے اور اس میں حرارت ہے تو یہ حرارت آگ میں محدود نہیں رہتی' بلکہ وہ ماحول میں سرایت کرتی ہے۔ آپ آگ پر کوئی چیز رکھیں گے یا اس میں ڈالیں گے تو وہ چیز بھی گرم ہو جائے گی۔ اسی طرح برف میں ٹھنڈک ہے تو وہ برف تک محدود نہیں رہے گی' وہ بھی ماحول میں سرایت کرے گی۔ آپ برف کو پانی میں ڈالیں گے تو برف پانی کو بھی ٹھنڈا کر دے گی۔ یہ قانونِ طبعی ہے —— اسی مثال سے سمجھئے کہ اگر کسی فرد کے اندر توحید فی الواقع جاگزیں ہو جائے' قائم ہو جائے اور وہ راسخ ہو' پختہ ہو اور حقیقی ہو' دھوکے اور فریب کی نہ ہو' یعنی ایسا نہ ہو کہ بظاہر تو بڑے موحد ہونے کے مدعی ہوں اور بباطن یعنی دل میں صنم خانے آباد ہوں۔ اس حقیقی اور خالص توحید کو لازماً ماحول میں سرایت کرنا چاہئے۔

باطن کے اصنام

اس سلسلہ میں چند تلخ حقائق ملاحظہ ہوں۔ ہمارے معاشرے میں کچھ لوگ ہیں جو موحد خالص ہونے کے دعوے دار ہیں۔ وہ قبر پرستی اور اس نوع کے مختلف مشرکانہ ومبتدعانہ افعال کی تو بجا طور پر بڑی مذمت کرتے ہیں' لیکن ان میں سے اکثر حضرات کا دھیان اس طرف نہیں جاتا کہ دولت پرستی بھی تو شرک ہے۔ اگر حصولِ دولت میں حلال و حرام کی تمیز ختم ہو گئی تو معلوم ہوا کہ دولت کو معبود بنالیا گیا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا : ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّینَارِ وَعَبْدُ الدِّرْھَمِ)) "ہلاک ہو جائے دینار اور درہم کا بندہ"۔ اس کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو گا کہ "ہلاک ہو گیا دینار و درہم کا بندہ"۔ دینار و درہم کا بندہ کون ہے؟ آنحضور ﷺ نے لفظ کون سا استعمال فرمایا! عبد۔ اس لئے کہ جس شخص کے دل میں دولت کی محبت اتنی ہے کہ وہ اسی تگ و دو میں لگا رہتا ہے کہ دولت ہر حال میں اس کے پاس آنی چاہئے' اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ حلال سے آئے یا حرام سے آئے' جائز سے آئے یا ناجائز سے آئے' صحیح راستے سے آئے یا غلط سے آئے —— دولت کی اس محبت کا مطلب یہ ہے کہ اس کا معبود دولت ہے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ ہندوؤں نے دولت کی ایک دیوی تراشی ہوئی ہے جس کا نام انہوں نے لکشمی دیوی رکھ چھوڑا ہے۔ اس کی وہ پوجا کس لئے کرتے ہیں! اس لئے کہ ان کو دولت ملے۔ درحقیقت وہ اس مورتی کے پردے میں دولت کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم نے صرف یہ کیا ہے کہ "لکشمی دیوی" کی کوئی مورتی ہمارے سامنے نہیں ہے' لیکن لکشمی دیوی کی پوجا سے ہندوؤں کا جو مقصود ہے وہی ہمارا بھی ہو جائے گا اگر ہم حرام و حلال اور شریعت کی قیود و شرائط سے بے نیاز ہو کر دولت کے حصول میں لگ جائیں۔ اس طور پر دولت معبود کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ دولت کے ایسے پجاریوں اور غلاموں کے لئے ہی آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ : ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّینَارِ وَعَبْدُ الدِّرْھَمِ))

اسی طرح ایک طرف اللہ کا حکم ہوتا ہے اور دوسری طرف نفس کی چاہت۔ مثلاً صبح سویرے کا وقت ہے' آنکھ بھی کھل گئی ہے' اذان بھی سنی ہے۔ یہ پکار کس کی ہے؟ مؤذن کی زبان سے ضرور نکلی ہے' لیکن پکار اس کی نہیں ہے' پکار تو اللہ کی ہے کہ —— حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ اور اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ۔ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے جو اس بات کی تفہیم میں ممد ہو سکتا ہے ؎

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی' دل محفل کا تڑپا بھی گئی!

تو زبان بے شک مؤذن کی ہے' لیکن صدا تو اللہ کی ہے۔ ایک طرف اللہ کی پکار ہے' دوسری طرف نفس کہتا ہے "سوؤ' ابھی آرام کرو"۔ یہ ہے وہ کشمکش جس سے اکثر لوگوں کو سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ہمیں معلوم نہ ہو۔ ہم میں سے اکثر کو اس کا تجربہ ہوا ہے۔ اب اگر مستقل طور پر یہ کیفیت ہو کہ اس وقت ہم نے اللہ کی پکار پر تو اپنے کان بند کئے اور نفس کی خواہش اور مرضی پر لبیک کہا تو ہمارا معبود کون ہوا؟ اللہ یا ہمارا نفس؟ معلوم ہوا کہ دل میں صنم خانہ آباد ہے۔ اسی بات سے متنبہ کیا گیا سورۃ الفرقان کی آیت ۴۳ میں : ﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ط اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا﴾ "اے نبی! آپ نے اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے۔ کیا آپ ایسے شخص کی نگرانی کر سکیں گے؟" غور کیجئے! یہاں لفظ الٰہ آیا ہے جو ہمارے کلمۂ شہادت کے جزوِ اوّل میں آتا ہے : لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ "کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے"۔ پس معلوم ہوا کہ معبود دولت بھی بنتی ہے' معبود نفس بھی بنتا ہے۔ دل کے اس صنم خانے کو ختم کرنا آسان کام نہیں ہے۔ پتھر کے تراشیدہ باہر کے بتوں کی نفی اور مذمّت آسان ہے۔ قبر پرستی کی نفی اور مذمت بھی آسان ہے ــــــ اور یہ نفی و مذمّت بالکل صحیح ہے' یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے' یہ توحید کا لازمہ ہے' اس میں غلطی کا کوئی شائبہ نہیں ــــــ لیکن دل کے اندر جو صنم خانے ہیں' حُبِّ مال ہے' حُبِّ جاہ ہے' حُبِّ اقتدار ہے' نفس کی مرضیات و خواہشات اور چاہتوں کی بجا آوری ہے' یہ تمام چیزیں توحید کی ضد ہیں۔ اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے بھی علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے کہ ؎

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے!
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں

چنانچہ اندر کے اس صنم خانے کو بھی دیکھنا ہو گا۔ دل کے سنگھاسن پر براجمان ان بتوں کو بھی توڑنا ہو گا۔ جب واقعتاً یہ ہو جائے اور ساتھ ہی باہر کے بت بھی ختم کر دیئے جائیں تو ایسے شخص کو بجا طور پر سچا موحّد کہلائے جانے کا استحقاق ہو گا۔ حقیق

موحّد بننے کے لئے لازم ہو گا کہ اللہ کی محبت بھی تمام محبتوں پر غالب آ گئی ہو اور دوسری تمام محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہو گئی ہوں۔ اسی طرح اللہ کی اطاعت تمام اطاعتوں سے اوپر ہو گئی ہو اور دوسری تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تحت آ گئی ہوں۔ اگر اس طور سے کوئی موحد بن گیا ہو تو ہو نہیں سکتا کہ ایسے موحّد کے وجود سے توحید دوسروں تک نہ پہنچے۔ یہ توحید لازماً متعدی ہو گی۔ ایک فرد سے دوسروں تک توحید پہنچنے کا یہ معاملہ ہے دعوت و تبلیغ ——— یعنی لوگوں کو بھی توحید کی طرف بلانا اور پکارنا ——— اور لوگوں تک بھی توحید کی دعوت کو پہنچانا۔

اجتماعی توحید کا نقطۂ عروج

اس طور پر جب انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف قدم بڑھے گا تو اس کا اگلا مرحلہ ہو گا پورے ماحول پر اللہ کی توحید کا سکّہ رواں کر دینا۔ یعنی پورا معاشرہ موحّد بن جائے' پوری قوم موحد بن جائے' پورا ملک موحد بن جائے' ملک کا نظام موحّد بن جائے' ملک کا دستور توحید کا مظہر بن جائے۔ یہ مرحلہ سر کر لیا تو اس کا نام ہے اقامتِ دین۔

خلاصہ

مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ خالص انفرادی سطح پر توحید فی العبادات اور توحید فی الدُّعاء ——— پھر اجتماعی سطح پر دعوت و تبلیغ ——— پھر ان دونوں مراحل سے اگلا قدم اقامت دین ——— یہ ہے توحیدِ کامل! یہ اصطلاحات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں تو اگلی بات بخوبی سمجھ میں آ جائے گی جس کے تانے بانے اور تمہید کے طور پر یہ سب باتیں بیان کی گئی ہیں۔

قرآن حکیم کی اِکیس سورتیں ایسی ہیں جن کا مرکزی مضمون و موضوع توحید ہے۔ ان میں چار سورتیں سورۃ الزمر' سورۃ المؤمن' سورۂ حٰم السجدۃ اور سورۃ الشوریٰ ہیں' ان میں اس عملی توحید کا تدریجاً بیان ہے جو بطورِ تانا بانا اور تمہید اوپر

بیان ہوا۔ بطورِ مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ان چار سورتوں کی ایک ڈور ہے جس میں توحید عملی کے موتی تدریجاً پروئے ہوئے ہیں اور یہ مضمون انفرادی توحید سے اجتماعی توحید کی طرف تدریجاً بڑھتا چلا جاتا ہے۔

قرآن میں انفرادی توحید کا بیان

سورۃ الزمر میں انفرادی توحید کا بیان ہے اور اس قدر شد و مد کے ساتھ' اتنی تاکید کے ساتھ اور اتنے اہتمام کے ساتھ ہے کہ میرے حقیر مطالعہ کے بموجب پورے قرآن مجید میں اس اسلوب کے ساتھ یہ بیان اور کہیں نہیں ملے گا۔ البتہ اس موقع پر اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ توحید کے موضوع پر جامع ترین سورۃ تو سورۃ الاخلاص ہی ہے جو بڑی مختصر سورۃ ہے۔ اس سورۃ کا مقام و مرتبہ یہ ہے کہ یہ توحید کا عطر ہے' یا یوں کہہ لیجئے کہ کوزے میں دریا بند کر دیا گیا ہے۔ اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے اس سورۂ مبارکہ کو ثُلثِ قرآن قرار دیا ہے۔ یہ اس اعتبار سے کہ تینوں بنیادی ایمانیات' یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرّسالت اور ایمان بالآخرۃ میں سے ایمان باللہ یعنی توحید کا بیان اس سورۃ میں انتہائی جامعیت کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ مزید یہ کہ اس سورۃ کا اسلوب خبریہ و بیانیہ ہے لیکن انشائیہ انداز اور شدّ ومدّ' انتہائی تاکید اور نہایت ہی پُر جلال اسلوب سے توحید عملی کا تدریجاً بیان ان چار سورتوں میں ہوا ہے جن کا ابھی اوپر ذکر ہوا۔

اصولی بات

اوپر بیان ہو چکا کہ توحید کے دو درجے ہیں' ایک توحید فی العلم' یا توحید فی المعرفت یا توحید فی العقیدہ۔ دوسرا توحید فی العمل یا توحید فی الطلب۔ پھر اس توحید عملی کے بھی تین مرحلے ہیں۔ پہلا توحید فی العبادات اور توحید فی الدعاء۔ دوسرا اسی توحید کی بندگانِ خدا کو دعوت' اسی کی تبلیغ —— اور تیسرا اسی توحید پر مبنی نظامِ حیات کا قیام و قرار' یعنی "اقامتِ دین"۔

توحید فی العبادۃ

توحید فی العبادۃ تمام انبیاء و رسل کی دعوت کا نقطۂ آغاز رہا ہے۔ اس بات کے لئے قرآن مجید کی متعدد آیات پیش کی جا سکتی ہیں' لیکن محدود وقت کے پیش نظر صرف چند آیات پیش ہیں —— سورۃ النحل میں فرمایا :

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ (النحل : ۳۶)

"ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت (غیر اللہ) کی بندگی سے بچو۔"

سورۃ الانبیاء میں فرمایا :

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ ﴾ (الانبیاء : ۲۵)

"(اے نبیؐ!) ہم نے آپؐ سے پہلے جو رسول بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں' لہٰذا صرف میری ہی بندگی کرو۔"

آخری پارے کی سورۃ البینہ میں واضح کیا گیا :

﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ... ﴾

"اور ان کو حکم نہیں ہوا تھا مگر اس بات کا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے یک سو ہو کر۔"

اس آخری آیت میں رسولوں اور ان کی اُمتوں کے لئے یہ ضابطہ بیان ہوا کہ سب کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ سب کے سب اللہ کی عبادت اسی کے لئے اپنی اطاعت خالص کرتے ہوئے بجا لائیں۔ یہ نہ ہو کہ بظاہر بندگی اللہ کی ہو لیکن اطاعت اللہ کے دشمنوں کی ہو رہی ہو' ساز باز اللہ کے باغیوں سے ہو رہی ہو' ان کے احکام کی تعمیل بھی ہو رہی ہو' ان کے سامنے سر بھی جھکائے جا رہے ہوں اور دعویٰ اللہ کی عبادت کا ہو —— یہ طرزِ عمل ہرگز مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ طرزِ عمل درکار ہے مُخْلِصِیْنَ

لَہُ الدِّیْنَ والا۔ پھر آخر میں حُنَفَآءَ کا اضافہ کیا گیا ہے' یعنی یک سو ہو کر —— کئی رنگی طرزِ عمل مطلوب نہیں ہے۔ اللہ کو تو دو رنگی بھی پسند نہیں ہے' کئی رنگی تو بہت دُور کی بات ہے۔ یہاں تو ایک رنگ چاہئے : ﴿ صِبْغَۃَ اللّٰہِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً ﴾ انسان یک رنگ ہو جائے' یک سو ہو جائے' وہ اپنے پورے وجودِ ظاہری و باطنی کے ساتھ فی الواقع اللہ کا بندہ بن جائے اور اللہ ہی کی بندگی میں ہمہ تن رنگ جائے۔

اب سورۃ البینہ کی اسی آیت کے مضمون کو سورۃ الزمر میں دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ مضمون وہاں کس شدومد اور کس تاکید کے ساتھ مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے۔ اور چونکہ اس میں انفرادی سطح پر توحیدِ عملی کا بیان ہے لہٰذا آپ دیکھیں گے کہ وہاں صیغہ واحد کا آئے گا' خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہو گا۔ لیکن اس اسلوب میں تخاطب اُمّت سے بھی ہے اور ان سے بھی جنہوں نے ابھی دعوت کو قبول نہیں کیا ہے۔ گویا تاقیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی اس کی مخاطب ہے۔

توحید فی العبادۃ ــ انفرادی عملی توحید

سورۃ الزمر کا آغاز ہوتا ہے : ﴿ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ○ ﴾ "اس کتاب کا نزول ہے اللہ کی طرف سے جو العزیز (نہایت زبردست) ہے' جو الحکیم (بے حد و حساب حکمت والا) ہے" ۔ ﴿ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ ﴾ "ہم نے نازل کی ہے (اے نبیؐ!) آپؐ کی طرف یہ کتاب (یعنی قرآن مجید) حق کے ساتھ" ۔ یہ فیصلہ کن کتاب ہے' جیسا کہ سورۃ الطارق میں الفاظ وارد ہوئے : ﴿ اِنَّہٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ﴾ ۔ اب اسی سے اقوامِ عالم کی قسمتوں کا فیصلہ ہو گا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے جس کے راوی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں :

((اِنَّ اللّٰہَ یَرۡفَعُ بِھٰذَا الۡکِتٰبِ اَقۡوَامًا وَیَضَعُ بِہٖ آخَرِیۡنَ)) (مسلم)

"اللہ تعالیٰ اس کتاب کی وجہ سے کئی قوموں کو سربلند کرے گا اور کئی دوسری قوموں کو پست کرے گا"۔

یعنی اللہ تعالیٰ اس کتاب کی وجہ سے ان قوموں کو عزت و سربلندی عطا فرمائے گا جو اس کو اپنا امام بنائیں گی۔ اور دوسروں کو' جو اس کو پس پشت ڈال دیں گی ذلت و نکبت سے دوچار فرمائے گا۔ قوموں کے عروج و زوال کی بنیاد یہ کتاب بنے گی ــــــ اب آگے وہ مضمون آ رہا ہے جس کے لئے یہ پوری تمہید باندھی گئی : ﴿ فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ ○ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ ﴾ یہ اسلوب اور مضمون آپ کو قرآن مجید میں کسی اور جگہ نہیں ملے گا۔ ان آیات کی ترجمانی یوں ہو گی : "(اے محمدؐ!) پس بندگی کرو اللہ کی' پوجو اللہ کو' پرستش کرو اللہ کی' اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ اور جان لو کہ خالص دین یعنی اطاعتِ کُلّی اللہ ہی کا حق ہے"۔ اللہ کے لئے ملاوٹ والا دین قابل قبول نہیں ہے۔ ملاوٹ والا دین منہ پر دے مارا

جائے گا۔ اللہ کے ہاں مقبول ہو گا دین خالص۔ ان آیات میں دو اہم الفاظ "عبادت" اور "دین" آگئے ہیں ـــــ اب یہاں توقف کر کے پہلے عبادت کے مفہوم اور معنی پر غور کیجئے۔ "دین" کے لفظ کی تشریح و توضیح آگے بیان ہو گی۔

دینی اصطلاح میں عبادت کا مفہوم

لفظ عبادت کے صحیح مفہوم کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے فارسی کے دو الفاظ جمع کر لیجئے تو بات پوری طرح سمجھ میں آجائے گی۔ وہ دو الفاظ ہیں بندگی اور پرستش ـــــ محض لفظ "بندگی" سے قرآن مجید کی اصطلاح "عبادت" کا مفہوم مکمل نہیں ہو گا اور محض "پرستش" سے بھی نہیں ہو گا۔ دونوں کو جمع کریں گے تو عبادت کا مفہوم ادا ہو جائے گا۔ بندگی میں اصل زور ہے اطاعت کی طرف۔ غلامی اور محکومی بندگی کہلائے گی۔ غلام اور محکوم تو اپنے آقا اور حاکم کا مطیع و فرماں بردار ہو تا ہے' اس کے دل کی کیفیت کچھ بھی ہو۔ دل میں وہ چاہے اپنے آقا اور حاکم کو گالیاں دے رہا ہو۔ چاہے وہ دل میں شدید باغیانہ جذبات رکھتا ہو۔ لہٰذا بندگی میں دل کی کیفیت سے بحث نہیں ہوتی۔ غلام اور محکوم کا کام ہے اپنے آقا اور حاکم کی اطاعت۔ گویا بندگی یا اطاعت عبادت کا جزوِ اعظم ضرور ہے' لیکن عبادت کی روح پرستش ہے۔ لفظ پرستش میں اصل زور محبت پر ہے۔ پرستار کس کو کہتے ہیں؟ وطن پرست کون ہے؟ جس کے دل میں وطن کی محبت ہر چیز کی محبت سے بالاتر ہو گی وہ وطن پرست کہلائے گا۔ زر پرست کون ہے؟ جس کے دل میں دولت کی محبت دوسری محبتوں پر غالب ہو جائے وہ زر پرست ہے۔ اسی طرح آپ کہتے ہیں شہوت پرست' شہرت پرست۔ ایسے لوگوں کو اپنی اس پرستش یعنی محبت کی تسکین چاہئے' چاہے وہ صحیح طریق سے ہو چاہے غلط طور پر ہو۔ نفس پرست اسے کہا جاتا ہے جو نفس کا غلام بن کر رہ جائے اور اس کی خواہش اور تقاضے کو جائز و ناجائز کی تمیز کئے بغیر پورا کرنے کے لئے تگ و دو کر رہا ہو۔ پس جو چیز بھی انسان کو انتہائی عزیز ہو گی اس کا وہ پرستار

کہلائے گا۔ لہٰذا جب بندگی اور پرستش اللہ ہی کے لئے جمع ہو جائیں‘ یعنی ہمہ تن‘ ہمہ وقت‘ ہمہ جہت اللہ ہی کی اطاعت اور اللہ ہی کی محبت سے انسان سرشار ہو جائے تو عبادتِ رب کا حق ادا ہو گا۔ شیخ سعدیؒ کا شعر ہے ؎

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی

اس شعر میں اس آیۂ مبارکہ ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴾ کی بڑی حد تک ترجمانی کی گئی ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں سورۃ البقرۃ کے بیسویں رکوع میں اللہ کی محبت والا مضمون آیا ہے۔ بہت پیارا مضمون ہے‘ اسے لوحِ دل پر کندہ کر لیجئے! فرمایا :
﴿ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ ﴾ "اور جو لوگ (حقیقی) صاحب ایمان ہیں‘ ان کی سب سے زیادہ محبت اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ اقدس سے ہوتی ہے۔" اگر یہ نہیں ہے تو حقیقی ایمان سے محرومی ہے۔ پھر تو محض ایک موروثی عقیدہ (Dogma) یا ایک Racial Creed ہے۔ حالانکہ مطلوب یہ ہے کہ اللہ کی محبّت اس درجہ کو پہنچ جائے کہ ہر محبت پر حاوی ہو جائے۔ ﴿ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ ﴾ حقیقی اہلِ ایمان کے لئے محبوب ترین اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہوتی ہے۔

تو جب محبت اور اطاعت اللہ کے لئے مل جائیں تو یہ ہو گی اللہ کی کامل بندگی۔ اور یہی درحقیقت عبادت کی وہ تعریف ہے جو امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمہما اللہ نے کی ہے۔ بلکہ حافظ ابن قیمؒ کے الفاظ اپنے استاذ سے بھی زیادہ پیارے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ : العبادة تجمع اصلين : غاية الحُبِّ مع غاية الذُلِّ والخضوع "عبادت دو بنیادوں کے جمع ہونے سے بنتی ہے۔ پہلی یہ کہ اللہ کے ساتھ انتہائی درجہ کی محبت ہو‘ دوسری یہ کہ انسان انتہائی درجہ میں اس کے سامنے اپنے آپ کو پست کر دے اور بچھا دے"۔ ان دونوں کے اجتماع کا نام ہے "عبادت"۔[1]

---

[1] حال ہی میں العلامہ الشیخ عبد الرحمن بن حسن آل شیخؒ کی ایک تصنیف راقم کی نظر سے ←

خالص اطاعت مطلوب ہے

فرمایا : ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ﴾ اب دیکھئے کہ یہ بات اپنی جگہ پر مکمل ہے۔ لیکن انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بڑا جھگڑالو ہے۔ کچھ نہ کچھ منطق فطری طور پر انسان کو ملی ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے سورۃ الکہف کی آیت ۵۴ کے آخری حصہ میں کہ : ﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝﴾ "اور انسان بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے"۔ پس وہ طرح طرح سے اپنے لئے بہانے بناتا اور حیلے تراشتا ہے۔ تو قرآن حکیم یہاں ہر نوع کے بہانے اور حیلے کا سدباب فرماتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے اصل دعوت تو حضور ﷺ کی امت اجابت و دعوت کو دینی ہے۔ ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ﴾ میں بات پوری آگئی تھی لیکن فرمایا : ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝﴾ "پس (اے نبیؐ!) عبادت کیجئے اللہ کی اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔" یہاں "دین" کا ترجمہ اطاعت ہے۔ اس لفظ میں اطاعت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اسی لئے تقریباً تمام ہی متقدمین و مؤخرین قرآن مجید کے مفسرین نے یہاں دین کا مفہوم اطاعت ہی بیان کیا ہے۔

یہاں اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ اللہ کے لئے اطاعت خالص ہو۔ یہ نہ ہو کہ کچھ اطاعت کسی کی اور کچھ اطاعت کسی اور کی، کچھ اللہ کی اور کچھ نفس کی، کچھ اللہ کی اور کچھ ایسے حاکموں کی جو اللہ کے احکام سے آزاد ہو کر کوئی حکم دے

☜ گزری۔ الشیخ مرحوم نے عبادت کی تعریف و توضیح ان الفاظ میں کی ہے : والعبادۃ اسم یجمع کمال الحب للّٰہ ونہایتہ فالحب الخلی عن ذل والذل الخلی عن حب لا یکون عبادۃ وانما العبادۃ ما یجمع کمال الامرین "عبادت ایسا اسم ہے جس میں کمالِ محبت اور اس کی انتہا اور اللہ کے سامنے کمال الذلہ اور اس کی انتہا پنہاں ہے، پس وہ محبت جس میں الذلہ نہ ہو اور وہ ذلت جس میں محبت نہ ہو عبادت کہلانے کی مستحق نہیں، بلکہ عبادت وہ ہے جس میں یہ دونوں چیزیں جمع ہوں"۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ عربی میں ذلت کے معنی پست ہو جانے اور بچھ جانے کے ہیں۔ (مرتب)

رہے ہوں۔ تو ایسی اطاعت خلوص و اخلاص کے ساتھ نہیں ہے' یہ ملاوٹ والی اطاعت ہے۔ ملاوٹ والی کوئی شے ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہوتی تو غور کا مقام ہے کہ ملاوٹ والی اطاعت اس اللہ عزّوجلّ کے لئے کیسے قابل قبول ہو گی جو خالق و مالکِ ارض و سماوات ہے' جو الغنی ہے' جو الحمید ہے' جو الغیور ہے! اسی تاکید کے لئے فَاعْبُدِ اللّٰهَ کے فوراً بعد فرمایا : مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ "پس اللہ کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے (اس کی عبادت کرو)"۔

نبی اکرم ﷺ نے اس ضمن میں نہایت جامع اور مختصر الفاظ میں ہمیں ایک فارمولا عطا فرمادیا ہے کہ ہم اس کو روزمرہ معاملات پر منطبق (apply) کرسکتے ہیں۔ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے : ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ)) "مخلوق میں سے کسی کی (ایسے معاملہ میں) اطاعت نہیں کی جائے گی جس سے خالق کی نافرمانی ہوتی ہو۔" اللہ کا ایک حکم ہے' والدین اس کے خلاف کوئی حکم دیں تو اطاعت نہیں ہو گی۔ اللہ کے حکم کے خلاف کوئی حکم اساتذہ دیں تو اطاعت نہیں ہو گی۔ اللہ کے حکم کے خلاف اقتدارِ وقت حکم دے تو اطاعت نہیں ہو گی —— اس لئے کہ فرمانِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے کہ ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ)) ہاں اللہ کے احکام کے دائرے کے اندر اندر والدین کی اطاعت بھی ہو گی' اساتذہ کی بھی اور اقتدارِ وقت کی بھی۔ تمدنی زندگی میں اطاعت کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں اولی الامر بھی شامل ہیں' والدین بھی' اساتذہ بھی' مرشدین بھی' بیوی کے لئے اس کا شوہر بھی۔ ان کے علاوہ بہت سے اور بھی —— ان سب کی اطاعت مباحات میں ہو گی۔ اللہ کے حکم سے آزاد ہو کر اطاعت کی جائے گی تو شرک لازم آئے گا۔

یہ ہے ان آیاتِ کریمہ کا اصل درس' حقیقی سبق' اصل دعوت اور واقعی انتباہ۔ ﴿ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ ﴾ —— قرآن مجید میں جہاں بھی "اَلَا" آیا ہے شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے اس کا بڑا پیارا ترجمہ کیا

ہے۔ یہ آج سے دو سو سال پہلے کا انداز ہے۔ وہ ترجمہ کرتے ہیں: "سنتا ہے!" تو یہ انداز بہت اچھا ہے۔ ﴿ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ﴾ "سن رکھو' آگاہ ہو جاؤ! اللہ ہی کے لئے ہے خالص دین یعنی مخلصانہ اطاعت"۔ اگر کسی اور کی اطاعت اللہ کی اطاعت سے آزاد ہو کر کی گئی' اسی طرح اگر اللہ کی محبت سے آزاد ہو کر کسی اور کی محبت کی آلائش شامل ہو گئی تو معاملہ تلپٹ ہو گیا' دگرگوں ہو گیا' اس میں ملاوٹ آ گئی۔ ہاں! اللہ کی محبت کے تابع اولاد سے محبت کرو کوئی حرج نہیں' وطن سے محبت کرو کوئی حرج نہیں' اپنے گھر سے محبت کرو کوئی حرج نہیں۔ لیکن یہ کہ اللہ کی محبت کے برابر اپنے دل کے سنگھاسن پر کسی کی محبت کو بٹھالیا تو یہ شرک ہے ـــــ اور اگر کسی کی محبت اللہ کی محبت سے بڑھ گئی تو شرک سے بھی اوپر کا کوئی لفظ ایجاد کرنا پڑے گا' کیونکہ ایسا لفظ ہماری لغت میں نہیں ہے ـــــ برابر کا معاملہ ہو گیا تو یہ شرک ہو جائے گا۔

یہاں ایک بات اور جان لیجئے کہ اطاعت کے ساتھ محبت کا ذکر کس بنیاد پر کیا گیا ہے! اس کی پہلی بنیاد تو لفظ عبادت ہے' جس کی تشریح ہو چکی کہ اس میں تذلل کے ساتھ غایت درجہ کی دلی محبت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ دوسری بنیاد لفظ اطاعت ہے جو طوع سے بنتا ہے۔ ہم اردو میں بھی طوعاً و کرہاً بولتے ہیں۔ طوع کے معنی دل کی آمادگی کے ہیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ دل کی آمادگی مستلزم ہے محبت کو۔

توحید فی العبادۃ کی اہمیت

سورۃ الزمر میں انفرادی توحید کا مضمون بڑی شدومد اور بڑی شان سے آیا ہے۔ ابتدائی تین آیات کا قدرے شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو چکا۔ اب چند آیات مزید دیکھئے۔

کسی اہم بات کو emphasize کرنے کے لئے' اس پر زور دینے کے لئے' اس کو خوب اچھی طرح ذہنوں میں اتارنے کے لئے مختلف اسالیب سے اس کی تکرار

اور اس کا اعادہ بھی ایک مؤثر ذریعہ بنتا ہے۔ وہی بات جو سورۃ کے آغاز میں آئی تھی' آیت ۱۱ میں دوبارہ آ رہی ہے۔ وہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا تھا اور انشائیہ انداز تھا کہ : ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ○﴾ یہاں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ ﴿قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ﴾ "(اے نبیؐ!) کہہ دیجئے کہ مجھے حکم ہوا ہے" ﴿اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ○﴾ "کہ میں اللہ کی بندگی اور پرستش کروں اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے"۔ یہاں کس حکم کا ذکر ہے' اسی کا جو ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ﴾ کی صورت میں ابتدائے سورۃ میں آ گیا تھا۔

اگلی آیت ۱۲ میں اسی مضمون کے مفہوم و مقصود کو مزید واضح فرما دیا : ﴿وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ○﴾ "اور مجھے تو حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے فرماں بردار مَیں خود بنوں"۔ یعنی اللہ کے احکام پر سب سے پہلے عمل پیرا مَیں خود ہوں' اللہ کے نواہی سے رُک جانے والا اور اللہ کے اوامر کو دل وجان سے بجالانے والا سب سے پہلے مَیں خود بنوں۔

آگے چلئے اور دیکھئے کہ نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے' درآنحالیکہ آپؐ معصوم ہیں' کس طرح خشیتِ الٰہی اور اللہ کی نافرمانی پر خوفِ آخرت کا اظہار کرایا جا رہا ہے۔ فرمایا : ﴿قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○﴾ "(اے نبیؐ!) یہ بھی کہہ دیجئے کہ اگر مَیں اللہ کے حکم کی نافرمانی کروں تو مجھے یومِ عظیم (آخرت) کے عذاب کا خوف اور اندیشہ ہے"۔ کون سے احکام کی نافرمانی سے خوف کا یہاں اظہار ہو رہا ہے ___ یہاں دو ہی تو حکم آئے ہیں' پہلا یہ کہ ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ﴾ دوسرا یہ کہ ﴿اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ لیکن ان دونوں احکام نے پوری زندگی کے فکر و نظر اور رویّہ و عمل کا احاطہ کر لیا ہے۔ اب اگر عملی زندگی میں اس توحید عملی کی ذرا سی بھی خلاف ورزی ہو جائے تو اس پر محبوبِ ربّ العالمین ﷺ سے کہلوایا جا رہا ہے ﴿اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○﴾ اس میں دراصل اہلِ ایمان کے لئے انتہائی مؤثر انتباہ ہے۔

آگے فرمایا : ﴿ قُلِ اللّٰہَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّہٗ دِیْنِیْ ○ ﴾ "اے نبی! (پھر) کہہ دیجئے کہ مَیں تو اللہ ہی کی بندگی اور پرستش کرتا ہوں اس کے لئے اپنے دین اور اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔"

اس آیت میں نبی اکرم ﷺ سے آپ کے اس عزمِ مصمم اور ثبات و استقلال کا اعلان کرادیا گیا کہ میری لائی ہوئی دعوتِ توحید کو کوئی قبول کرے یا نہ کرے' مَیں تو ہر حال میں اللہ ہی کی مخلصانہ بندگی اور پرستش کرتا ہوں اور کروں گا۔ اور میری اطاعت اسی کے لئے مخصوص ہے اور رہے گی۔

تاکیدِ مزید

آگے اسی سورۂ مبارکہ کے ساتویں رکوع کی تین آیات (۶۴'۶۵ اور ۶۶) میں یہ مضمون پورے نقطۂ عروج (Climax) کو پہنچ گیا ہے۔ اس سے زیادہ تاکیدی اسلوب آپ کو کہیں نہیں ملے گا ___ فرمایا : ﴿ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ○ ﴾ "(اے نبی ﷺ !) کہہ دیجئے کہ اے جاہلو! (اے نادانو! اے حرص و ہوا کے بندو!) کیا تم مجھے یہ حکم (اور مشورہ) دے رہے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں؟" دیکھئے وہاں جو کشاکش چل رہی تھی' اور وہ کشاکش توحید اور شرک کے مابین ہی تھی' اس کشاکش میں نبی اکرم ﷺ پر دباؤ پڑ رہا ہے۔ سارے وفود جناب ابو طالب کے پاس کس لئے آئے تھے؟ ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ محمد (ﷺ) سے کہہ دو کہ ہم انہیں اپنا بادشاہ بنانے کے لئے بھی تیار ہیں' اگر انہیں دولت درکار ہے تو اس کے انبار بھی ان کے قدموں میں لگا دیتے ہیں' جہاں چاہیں' جس خاندان میں چاہیں بس اشارہ کردیں ہم آپ کا وہاں نکاح کرنے کے لئے بھی آمادہ ہیں' لیکن آپ اپنی اس دعوت سے باز آجائیں ___ یہاں قریش کے ان بڑے بڑے سرداروں سے خطاب کیا جا رہا ہے اور خطاب بھی نہایت تیکھا اور تند و تلخ انداز میں اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ کے الفاظ سے۔ یہ بڑا تیکھا انداز ہے جو قرآن نے براہِ

راست خطبات میں اختیار کیا ہے۔ عام طور پر خطاب کا یہ انداز نہیں ہے' لیکن یہ موقع ہی ایسا ہے کہ اندازِ تخاطب دو ٹوک ہو اور اس میں سختی ہو ـــــ ویسے لفظ جاہل کے عربی میں وہ معنی نہیں ہیں جو اردو میں ہیں۔ اردو میں جاہل اَن پڑھ کو کہتے ہیں۔ عربی میں جذبات اور خواہشات سے مغلوب کو جاہل کہتے ہیں۔ اس کے مقابلہ کا لفظ ہے حلیم۔ حلیم اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیتا ہے' غور و فکر کرتا ہے' تحمل کرتا ہے' بردباری اختیار کرتا ہے اور عقل کی رہنمائی میں کوئی فیصلہ کرتا ہے' جبکہ جاہل وہ ہے جو اپنے جذبات اور خواہشات کے تابع ہو کر اقدام کرتا ہے ـــــ اس لئے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے: اے حرص و ہوا کے بندو! یعنی اے خواہشات کے غلامو! ـــــ کیا تم رسول اللہ ﷺ سے یہ توقع رکھتے ہو اور ان کو یہ حکم اور مشورہ دینے کی جسارت کرتے ہو کہ آپؐ اللہ کے سوا کسی اور کو پوجیں یا اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی اور پرستش کریں ـــــ معاذ اللہ!

توحید فی العبادۃ کی تاکید کی انتہا

آگے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ﴾ "اور (اے نبیؐ!) یقیناً آپ کی طرف بھی وحی کی جا چکی ہے اور ان کی طرف بھی جو آپ سے پہلے گزر چکے ہیں' اگر بالفرض آپ نے بھی شرک کیا تو جان لیجئے کہ لازماً آپ کے سارے اعمال حبط اور اکارت ہو جائیں گے اور آپؐ بھی لازماً خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے"۔ یہ بڑا چونکا دینے والا انداز ہے۔ اس کا ترجمہ کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے۔ اس میں شرک پر جس غیظ و غضب کا اظہار ہے وہ اس بات سے ظاہر ہے کہ انتہائی تاکید کے دو اسلوب یہاں موجود ہیں۔ یَحْبَطْ اور تَكُوْنُ سے پہلے لام تاکید اور پھر مزید تاکید کے لئے آخر میں نون مشدد لایا گیا ہے ـــــ میں نے ترجمہ میں یہ احتیاط کی ہے کہ لفظ "بالفرض" کا اضافہ کر دیا' کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے شرک کے

ظہور کا کسی نوع کا کوئی امکان سرے سے نہیں ہے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ لیکن بات میں زور پیدا کرنے اور قرآن مجید کی دعوتِ توحید کے مخاطبین اوّل اور تاقیامِ قیامت آنے والی نوعِ انسانی کو شرک کی شناعت سے متنبہ کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار کیا گیا کہ اے محمد (ﷺ)! اگر آپ بھی شرک کریں گے تو آپ کا مقام اور آپ کا مرتبہ' آپ کے محبوبِ ربّ العالمین ہونے کی حیثیت بھی آپ کو اللہ کی پکڑ سے نہیں بچا سکے گی اور آپ کے تمام اعمال لازماً کارت ہو جائیں گے اور آپ بھی لازماً زمرۂ خاسرین میں سے ہو جائیں گے ـــــ یہ ہے توحید فی العمل کا تقاضا اور اس کی اہمیت ـــــ قرآن مجید کے ایسے مقامات کے مطالعہ ہی سے شاید علامہ اقبال نے یہ شعر کہا تھا۔ ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

آگے فرمایا : ﴿ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ ﴾ لہٰذا (اے نبیؐ!) آپ بس اللہ ہی کی بندگی کیجئے اور اللہ کے شکر گزار بندوں میں سے بن جایئے"۔ یہ عبادت کی تاکید' اللہ کی بندگی اور پرستش کا مؤکد حکم ہے۔ یہاں عبادت سے مراد محض ارکانِ اسلام یعنی شہادتین' صلوٰۃ' صوم اور حج نہیں' بلکہ پوری زندگی اللہ کی بندگی میں بسر کرنا مراد ہے۔ اسی رویّہ کی ایک تعبیر شکر ہے۔

خلاصۂ کلام

سورۃ الزمر کے تین مقامات سے تین' پھر چار اور پھر تین آیات' یعنی کل دس آیات کی قدرے تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انفرادی سطح پر عملی توحید کیا ہے۔ وہ ہے اللہ کا بندہ بن جانا ہمہ تن' ہمہ وقت' ہمہ جہت ـــــ اطاعت اسی کے لئے خالص ہو۔ دوسروں کی اطاعت کی جائے تو اس کی اطاعت کے تابع ہو کر کی جائے' اس سے آزاد ہو کر نہ کی جائے۔ بنیادی اور حقیقی

شدید ترین محبت اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہو۔ دوسروں سے محبت اس سے نیچی نیچی اور ورے ورے اور اس کی محبت کے تابع ہو۔ گویا سب سے اونچی محبت اللہ ہی کی ہو۔ انفرادی توحید کی یہ شرط لازم ہے کہ عبادت' اطاعت اور محبت اسی کے لئے خالص کرلی جائے ــــــ اگر اس میں کہیں ملاوٹ آگئی تو وہ توحید نہیں ہے۔ یہ ملاوٹ اور یہ کھوٹ شرک کے درجے میں آئے گی اور اگلے پچھلے تمام اعمال کے حبط اور اکارت بننے کا ذریعہ بن جائے گی۔

توحید فی الدُّعاء

انفرادی سطح پر توحید فی العبادۃ کے ساتھ ہی توحید فی الدعاء کا معاملہ ہے۔ یہ دونوں امور باہم گتھے ہوئے ہیں۔ ہم نبی اکرم ﷺ کی یہ احادیث بھی پڑھ چکے ہیں کہ ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) اور ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) ـــــ توحید فی العبادۃ کے ضمن میں سورۃ الزمر کے تین مقامات اور ان کی امکانی حد تک تشریح و توضیح کے بعد ہم سورۃ المؤمن کے دو مقامات کا مطالعہ کریں گے جہاں پر توحید فی الدعاء کا بڑے شدومد کے ساتھ ذکر ہے۔

دُعا درحقیقت انفرادی سطح کی عبادت کا ہی ایک باطنی پہلو ہے۔ جو آپ کا معبود ہے' جس کے بارے میں آپ کا ایمان اور یقین ہے کہ وہی حاجت روا اور مشکل کشا ہے' جس کے متعلق آپ کو یقین ہے کہ وہی عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے' وہی اَلسَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ہے' وہ ہر آن آپ کے ساتھ ہے ﴿ هُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ﴾ ظاہر بات ہے کہ ایسی ہستی کو آپ پکاریں گے' اس سے استعانت و استمداد کریں گے' اس سے دعائیں کریں گے' اس سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے عرض و معروض کریں گے۔ پس دُعا عبادت کا ایک باطنی رخ ہے۔ قرآن میں چار مقامات ہیں جہاں دُعا کے ساتھ ﴿ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ ایک سورۃ العنکبوت آیت ۶۵ میں: ﴿ فَاِذَا رَكِبُوْا فِی الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ﴾ "جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں" ـــــ دوسرے سورۂ لقمان کی آیت ۳۲ میں: ﴿ وَاِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ﴾ "اور جب (سمندر میں) ایک موج ان لوگوں پر سائبان کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ ہی کو پکارتے ہیں اپنے دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے"۔ ان دو آیتوں میں سمندری سفر میں مشرکین کی اللہ سے مخلصانہ دعا کا تذکرہ

ہے۔ اس موقع پر انہیں نہ لات یاد آتا ہے' نہ منات نہ ہبل۔ کسی دیوی اور دیوتا کے بجائے وہ خالص اللہ ہی کو مدد اور دستگیری کے لئے پکارتے ہیں [1]۔ لیکن سورۃ المؤمن کی آیت ۱۴ اور ۶۵ جس کا بیان آگے آئے گا' وہ مقام ہے جہاں انشائیہ انداز اور امر کے صیغہ میں دُعا کے ساتھ "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" کے الفاظ آئے ہیں ـــــ اللہ کو پکارو! لیکن کس طرح؟ کس شان سے؟ کس کیفیت میں؟ اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ یہ نہیں کہ کچھ اطاعت اللہ کی بھی ہو رہی ہے اور کچھ دوسروں کی بھی' لیکن پکار رہے ہیں اللہ کو۔ ایسی دُعا قبول ہونے والی نہیں ہے۔ اب وہ آیت دیکھئے۔ بڑی پیاری آیت ہے۔ فرمایا :

---

[1] اس ضمن میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابوجہل کے ایمان لانے کے واقعہ کا ذکر کرنا مناسب حال ہوگا۔ ان کی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ "جب مجھے علم ہوا کہ میرا نام ان مجرموں میں شامل ہے جن کے قتل کا حکم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر جاری فرما چکے تھے تو میں نے قتل کے خوف سے حبشہ منتقل ہونے کے لئے مکہ چھوڑ دیا۔ جب ساحل سے حبشہ جانے کے لئے کشتی میں سوار ہوئے تو اثنائے راہ میں زبردست طوفان آ گیا۔ مسافروں نے پہلے تو اپنے دیوی اور دیوتاؤں کو پکارا' لیکن طوفان شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا تو ان کی زبان سے نکلا کہ اب تو صرف "اللہ" ہی ہمیں بچا سکتا ہے' چنانچہ سب ہی نہایت الحاح و زاری کے ساتھ اللہ سے اس مصیبت سے نجات کی دعائیں کرنے لگے۔ دُعا قبول ہوئی اور طوفان تھم گیا' البتہ طوفان نے کشتی کو جدہ کی بندرگاہ ہی پر واپس دھکیل دیا" ـــــ اس کے بعد حضرت عکرمہ اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ: "اس موقع پر اچانک میرے دل میں روشنی پھوٹی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت اسی توحید ہی کی تو ہے' اور یہ بُت انسان کے کام آنے والے نہیں' یہ تو ہمارے ہاتھوں کے تراشیدہ بے چارے اور معذور ہیں" ـــــ آگے وہ کہتے ہیں کہ "مَیں نے دل میں اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر میں طوفان سے بچ گیا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لوں گا"۔ جب جدہ پر کشتی واپس آئی تو وہاں انہوں نے اپنی اہلیہ کو موجود پایا جو خود بھی مشرف باسلام ہو چکی تھیں اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے معافی کی نوید لائی تھیں۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو بڑا اطمینان ہوا کہ وہ معافی کی خوشخبری سننے سے قبل ہی اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ (مرتب)

﴿ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ ﴾

(المومن:۱۴)

"پس اللہ ہی کو پکارو' اپنی اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے' خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے"۔

ظاہر بات ہے کہ اگر پورا نظام شرک پر قائم ہو اور اس میں آپ توحید کا نظام برپا کرنا چاہیں گے تو کافروں اور مشرکوں کو سخت ناگوار ہو گا۔ وہ سب روڑے اٹکائیں گے اور کسی نہ کسی بہانے آپ سے تصادم مول لینے کی کوشش کریں گے۔

یہاں دعاء کے لئے بھی مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کی شرط عائد کر دی گئی ہے' جیسے عبادت میں عائد کی گئی تھی۔ خلوص و اخلاص صرف اللہ ہی کے لئے نہ ہو تو اس سے دعا کرنا' اسے پکارنا بے معنی ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث ملاحظہ کیجئے جس سے دعاء کی قبولیت کی شرائط واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابو ہریرہ بنٹھ ہیں اور امام مسلمؒ نے اس کو اپنی صحیح میں بیان کیا ہے۔ حدیث کا دُعا سے متعلق حصہ یہ ہے :

((ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ اِلَى السَّمَآءِ يَارَبِّ يَارَبِّ' وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ' فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ؟))

"پھر آنحضور ﷺ نے ایک شخص کا ذکر فرمایا کہ وہ بہت دُور دراز کا سفر کرتا ہے' اس کے بال اور کپڑے غبار آلود ہیں' اس پر بڑی بوسیدگی' بے چارگی اور درماندگی طاری ہے۔ وہ شخص اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا رہا ہے کہ اے رب! اے رب!..."

دیکھئے حالت سفر میں دعا کی مقبولیت کی آنحضور ﷺ کی طرف سے خبر دی گئی ہے۔ مسافرت چونکہ مسکنت کی حالت ہوتی ہے' انسان بے یار و مددگار ہوتا ہے' اجنبیوں میں ہوتا ہے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ سفر کی حالت میں دُعا دل سے نکلتی ہے اور جو دُعا دل

سے نکلے وہ اثر رکھتی ہے اور قبول ہوتی ہے۔ اور عام طور پر گمان یہی ہے کہ یہاں نبی اکرم ﷺ کسی شخص کے سفرِ حج کا ذکر فرما رہے ہیں۔ حج کے لئے دُور دراز سے اور مختلف مقامات سے لوگ آتے ہیں' تھکے ماندے۔ پھر مناسک حج بڑے کٹھن اور مشقت طلب ہوتے ہیں۔ منیٰ کا سفر ہے' وقوفِ عرفہ ہے' مزدلفہ میں پڑاؤ ہے' منیٰ واپسی ہے' رمی جمار ہے' نحر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دسویں تاریخ کا دن بڑا سخت اور مشقت سے پُر ہوتا ہے' ہر شخص تکان سے اس روز چور چور ہوتا ہے۔ ان دشوار اور دقت طلب مواقع کا تصور کیجئے اور دیکھئے کہ ان حالات میں ایک شخص اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف دُعا کے لئے اٹھاتا ہے اور کہتا ہے یا ربّ! یا ربّ! —— جبل رحمت کا مقام سمجھ لیجئے' یا وقوفِ عرفہ کا نقشہ کھینچ لیجئے' یا مقامِ ابراہیم کو خیال کر لیجئے یا ملتزم کا منظر تصور کی نگاہوں میں لے آیئے' جہاں اس سے چمٹے ہوئے لوگ گڑگڑا کر دعائیں کرتے ہیں —— لیکن ((فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ)) "ایسے شخص کی دُعا قبول ہو تو کیسے ہو؟" ((وَمَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَغُذِّيَ بِالْحَرَامِ)) "جبکہ اس کا کھایا ہوا بھی حرام کا ہے' اس کا پہنا ہوا بھی حرام کا ہے اور جس غذا سے اس کا جسم پروان چڑھا ہے وہ بھی حرام کی ہے" —— معلوم ہوا کہ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ والا معاملہ تو ہے ہی نہیں۔ کمائی میں تو اللہ کا حکم مانتا نہیں' معاش میں تو حرام میں منہ مار رہا ہے اور یہاں آ رہا ہے دعائیں کرنے کے لئے۔ کیا منہ ہے اس کا کہ وہ اللہ سے کلام کرے!

یہی بات ہے جو سورۃ البقرۃ میں ارشاد فرمائی گئی ہے کہ ہم تو تمہاری دعائیں سننے اور قبول کرنے کے لئے تیار ہیں' لیکن ہمارے بندو! یہ بھی تو دیکھو کہ تم ہمارے احکام کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہو!! فرمایا :

﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ○ ﴾

(البقرۃ : ۱۸۶)

"(اے نبیؐ!) جب میرے بندے آپؐ سے میرے بارے میں پوچھیں تو ان کو بتا دیجئے کہ میں قریب ہی ہوں [1]۔ میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں اور قبول کرتا ہوں' وہ جہاں اور جب مجھے پکارے' پس انہیں چاہئے کہ میری باتوں کو قبول کریں (میرے احکام پر عمل کریں' میری پکار پر لبیک کہیں) اور مجھ پر ایمان رکھیں' تاکہ وہ راہِ راست پالیں (کامیابی سے ہم کنار ہو جائیں)"۔

معلوم ہوا کہ یہ یک طرفہ معاملہ (One Way Traffic) نہیں ہے' یہ دو طرفہ معاملہ ہے۔ تم اللہ کا کہنا مانو گے' اس کے احکام پر چلو گے' اس کے مطیع بن کر رہو گے' اس پر ایمان رکھو گے تو اللہ تمہاری دعائیں قبول کرے گا۔ تم اللہ سے محبت کرو گے تو اللہ تم سے محبت کرے گا ﴿ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ ﴾ یہ شان ہو گی اہل ایمان کی ـــــ تم اللہ کو یاد کرو' اللہ تمہیں یاد کرے گا ﴿ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ ﴾

حدیث میں اس کی وضاحت آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ اگر مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں' اور اگر میرا بندہ کسی محفل میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس سے کہیں اعلیٰ محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ وہ محفل ملائکہ مقربین ہی کی ہو سکتی ہے۔ اس محفل میں اللہ تعالیٰ اس بندے کا ذکر فرماتا ہے جو اس دنیا میں کسی محفل میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ آگے حدیث میں آتا ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : "اگر بندہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں' بندہ اگر بالشت بھر میرے قریب ہوتا ہے تو میں ہاتھ بھر اس کے قریب ہو جاتا ہوں"۔

قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا : ﴿ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ﴾

---

[1] اللہ تعالیٰ کی قربت اور معیت کی تفہیم کے لئے سورۂ ق کا یہ مقام : ﴿ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴾ اور سورۃ الحدید کا یہ مقام : ﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ﴾ پیش نظر رہیں۔ (مرتب)

"اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا"۔ اللہ کی مدد بندے کی جانب سے کیا ہے؟ اس کے دین کے غلبے اور اقامت کے لئے مال اور جان کھپا دینا۔ جیسا کہ سورۃ الصف میں ارشاد فرمایا: ﴿ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ﴾ "تم ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اس کی راہ میں اپنے مالوں کے ساتھ اور اپنی جانوں کے ساتھ"۔ معلوم ہوا کہ اللہ کے ساتھ معاملہ یک طرفہ کی بجائے دو طرفہ ہو گا۔

اِخلاص فی الدُّعاء

سورۃ المؤمن کی آیت ۱۴ کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں: ﴿ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ﴾ "پس پکارو اللہ کو' دین یعنی اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے' چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو"۔ اسی سورۃ المؤمن کی آیت ۶۰ بھی اس موضوع پر بہت اہم ہے۔ فرمایا:

﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝ ﴾

"اور تمہارے رب نے یہ فرمایا ہے کہ مجھے پکارو! میں تمہاری پکار سنوں گا' (تمہاری دعائیں قبول کروں گا) حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بربنائے تکبر اور گھمنڈ میں آ کر میری عبادت سے اعراض کرتے ہیں (منہ موڑتے ہیں) وہ جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر"۔

اس آیت سے استدلال کیا جائے گا کہ عبادت اور دُعا ایک ہی ہے۔ ممکن ہے کہ اسی آیت کی تشریح و تفسیر میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہو کہ ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) اور ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) ـــــ غور کیجئے کہ اس آیت کریمہ کے پہلے حصہ میں دُعا کا اور دوسرے حصہ میں عبادت کا ذکر آیا ہے تو آپ خود بھی کسی تامل کے بغیر اس نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں کہ دُعا اور عبادت ایک ہی عمل کے دو رُخ ہیں' اس میں کسی اشتباہ

کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔

آگے اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۶۵ ہے جس میں یہ بات پھر آئی۔ فرمایا :

﴿ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ ﴾

"وہ (اللہ) الحی ہے' ہمیشہ ہمیش زندہ رہنے والا ہے' اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس اسی کو پکارو دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ کل شکر و سپاس اور تعریف و ثنا اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے"۔

دیکھئے یہاں اس آیت میں توحید کے ذکر سے آغاز ہوا اور توحید کے بیان پر ہی اس آیت کا اختتام ہوا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ شہادتین کا پہلا جزو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کلمۂ توحید ہے۔ اسی طرح جان لیجئے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ بھی کلمۂ توحید ہی ہے جو نہ صرف سورۃ الفاتحہ کی (جس کو اُمّ القرآن اور اساس القرآن کے نام بھی دیئے گئے ہیں) پہلی آیت ہے بلکہ قرآن مجید کی بھی پہلی آیت ہے۔

اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۶۶ میں بھی عبادت کے بدل کے طور پر دعا ہی کا ذکر آیا ہے۔ فرمایا :

﴿ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ ﴾

"اے نبیؐ! ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ مجھے تو ان ہستیوں کی عبادت سے منع کر دیا گیا ہے جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو (میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں) جب کہ میرے پاس میرے پروردگار کی طرف سے بیّنات (کھلی کھلی نشانیاں) آ چکی ہیں۔ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں اور اس کا فرماں بردار و مطیع بندہ بن کر رہوں"۔ [1]

---

[1] دو آیات مزید ملاحظہ ہوں جن میں نہی کے اسلوب میں اللہ کے سوا یا اللہ کے ساتھ کسی اور سے دعا کی ممانعت کی گئی ہے۔ مخاطب نبی اکرم ﷺ ہیں' لیکن آپ ﷺ کی ←

آپ نے دیکھا کہ سورۃ الزمر میں عبادت کا کس قدر تاکید اور شدّ و مدّ کے ساتھ بیان ہے "اطاعت کو اللہ ہی کے لئے خالص کرتے ہوئے"۔ اور اگلی سورت سورۃ المؤمن میں دُعا کا ذکر آ گیا، لیکن دُعا بھی اللہ ہی کے لئے اپنے دین کو خالص کرتے ہوئے۔ اس طرح انفرادی سطح کے خارجی اور باطنی دونوں پہلوؤں کا احاطہ ہو گیا۔

← وساطت سے پوری نوعِ انسانی بالعموم اور مدعیانِ ایمان بالخصوص مخاطب ہیں۔ پہلی آیت سورۂ یونس کی ہے۔ فرمایا: ﴿ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ ﴾ "اور (اے نبیؐ!) اللہ کو چھوڑ کر کسی ہستی کو نہ پکارو، (اللہ کے سوا) کوئی چیز نہ آپ کو فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ اگر (بالفرض) آپؐ نے ایسا کیا تو آپؐ بھی ظالموں (یعنی مشرکوں) میں سے ہو جائیں گے" —— دوسری آیت سورۃ الشعراء کی ہے، فرمایا: ﴿ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ○ ﴾ "پس (اے نبیؐ!) اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو۔ اور اگر (بالفرض) آپؐ نے ایسا کیا تو آپ بھی سزا پانے والوں میں سے ہو جائیں گے"۔ نہی کے اسلوب میں جو تاکید اور جو زور ہوتا ہے نیز "مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" اور "مَعَ اللّٰهِ" میں جو تمیز و امتیاز اور فرق و تفاوت ہے وہ بادنیٰ تامل سمجھ میں آ سکتا ہے۔

دعوت الی اللہ : دعوتِ توحید

انفرادی توحید جب فرد سے آگے بڑھے گی تو یہ کام توحید کی دعوت کی شکل اختیار کرے گا۔ یعنی لوگوں کو اللہ کی توحید کی طرف بلانا اور پکارنا ـــــ چنانچہ اسی سورۃ المؤمن میں اس ضمن میں مؤمن آلِ فرعون کا ایک قول نقل ہوا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ آلِ فرعون میں سے ایک بڑی بااثر شخصیت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئی تھی' جو بڑے پائے کے درباری بھی تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے ایمان کو چھپائے رکھا تھا' تاآنکہ جب وہ مرحلہ آیا کہ فرعون نے کہا کہ اب میں موسیٰ کو قتل کر کے رہوں گا۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ میرے درباریوں میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کچھ حامی (Supporters) موجود ہیں۔ اگر اسے یہ اندازہ نہ ہوتا تو اسے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی بات رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنے دربار میں تجویز پیش کرتا ہے کہ ﴿ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی ... ﴾ "مجھے چھوڑو' میں موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کیے دیتا ہوں...."۔ حالانکہ خدائی کا دعوے دار ہے' دنیا میں بادشاہوں کا یہ حال ہوتا ہے۔ اگر اس کے منصب دار اس کا ساتھ نہ دیں' اس کے پنج ہزاری' بیس ہزاری' تیس ہزاری اس کی پشت پر نہ ہوں' اس کی فوج کے بڑے بڑے جرنیل اور سپہ سالار اور دوسرے بااثر لوگ اس کے ساتھ نہ ہوں تو اکیلے بادشاہ سلامت کیا کریں گے! یہی وجہ ہے کہ جب فرعون کو اندازہ ہو گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا اثر میرے چند درباریوں پر بھی ہو چکا ہے تو اس نے قدم اٹھانے سے پہلے ضروری سمجھا کہ اپنے درباریوں سے استصواب کر لے اور ان کی رائے اور تائید حاصل کر لے۔ اسی لئے اس نے دربار میں کہا : ﴿ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی ﴾ "اب مجھے اجازت دو کہ مَیں موسیٰ کو قتل کر دوں"۔

مؤمنِ آلِ فرعون کی دعوتِ توحید

اس موقع پر وہ مؤمنِ آلِ فرعون کھڑے ہو گئے ـــــ اس سورت کا نام ہی سورۃ "المؤمن" ہے۔ اس لئے کہ ان مؤمنِ آلِ فرعون کی تقریر اس سورت میں بڑی تفصیل سے آئی ہے ـــــ پورے قرآن مجید میں کسی نبی یا رسول کی بھی اتنی طویل تقریر نقل نہیں ہوئی ہے جتنی ان مؤمنِ آلِ فرعون کی ـــــ مؤمنِ آلِ فرعون اس موقع پر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے نہایت مؤثر تقریر کی جو قرآن میں نقل ہوئی ہے، جس کے نتیجہ میں فرعون کو، جو خدائی کا دعوے دار اور مدعی تھا، اپنا Resolution واپس لینا پڑا ـــــ ان کی تقریر کا پورے دربار پر اتنا اثر ہوا کہ پھر فرعون کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہاتھ ڈالے۔ اب آیئے مؤمنِ آلِ فرعون کے اس قول کی جانب جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

اس تقریر میں وہ مؤمن آلِ فرعون کہتے ہیں : ﴿ وَيٰقَوْمِ مَالِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ۝ ﴾ اے میری قوم کے لوگو! کیا معاملہ ہے، غور کرو، میں تمہیں نجات کی دعوت دے رہا ہوں، میں تمہیں اس راستہ کی طرف پکار رہا ہوں جو فوز و فلاح اور رُشد و کامرانی کی طرف لے جانے والا ہے اور تم مجھے آگ کی طرف بلا رہے ہو۔ ﴿ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۡ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ۝ ﴾ تم تو مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور اس کے ساتھ شرک کروں جس کے لئے کوئی علم اور کوئی سند یا دلیل میرے پاس نہیں ہے۔ اور میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں اس ہستی کی طرف جو العزیز ہے، الغفار ہے۔ ہر نوع اور ہر قسم کے اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں اور وہ بہت معاف فرمانے والا ہے۔

دعوتوں کا فرق

مؤمنِ آلِ فرعون کے ان اقوال میں یہ بات بھی واضح طور پر آگئی ہے کہ دنیا

میں دونوں دعوتیں بیک وقت موجود رہتی اور چلتی ہیں۔ توحید اور ایمان کی دعوت بھی اور کفر و شرک کی دعوت بھی ـــــ قیامت تک یہ دعوتیں چلتی رہیں گی۔ جیسے علامہ اقبال نے اس شعر میں کہا ہے ؏

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!!

داعیانِ حق بھی رہیں گے اور داعیانِ باطل بھی رہیں گے، اور ان میں سے بھی رہیں گے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور کہلواتے ہیں۔ کیا جلال الدین اکبر اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہلاتا تھا؟ کیا اس دور میں بھی کچھ ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جو مسلمانوں جیسے نام رکھ کر اور خود کو مسلمان کہلا کر الحاد، زندقہ، بے حجابی، بے پردگی، اباحیت اور نہ معلوم کس کس ضلالت کی طرف دعوت دینے میں نہایت منظم طریق اور بہترین تکنیک سے مصروف ہیں! ایسے لوگ موجود ہیں اور یقیناً موجود ہیں۔ ان کی اکثریت ذرائع ابلاغ اور بڑے بڑے کلیدی مناصب پر فائز ہے اور وہ ہمارے معاشرے میں اسلامی فکر اور اسلامی اقدار میں سرنگیں لگا رہے ہیں اور اسلام کی جڑیں کھود رہے ہیں۔ ہمارے اسی معاشرے میں حدود اللہ کا تمسخر و استہزاء اور اس سے بغاوت کرنے والے موجود ہیں اور اسی کی دعوت دینے اور ترویج میں لگے ہوئے ہیں، اسی کام میں وہ اپنی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں لگا رہے ہیں۔

لہٰذا دنیا میں دعوتیں ہمیشہ دونوں موجود رہی ہیں ـــــ ایک ہے توحید کی دعوت اور ایک ہے کفر کی دعوت۔ ایک دعوت ہے اسلام کی، ایک ہے شرک اور الحاد کی ـــــ اور ہمارے معاشرے میں بھی بالفعل و بالقوۃ یہ مختلف دعوتیں موجود ہیں، بلکہ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ باطل کی دعوت بہت منظم اور ہمہ گیر ہے۔ اس کے داعیان بڑے عیار اور چالاک ہیں، پھر ذرائع ابلاغ پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے جس کے ذریعے وہ معاشرے میں گمراہی پھیلا رہے ہیں۔ وہ ہماری ان کمزوریوں سے خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں جو ایک طرف ﴿ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ○ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ○ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ○ ﴾ کے ذیل میں آتی ہیں،

دوسری طرف ان کا سبب ڈیڑھ دو صدیوں تک انگریزوں کا سیاسی استیلاء ہے جس کے باعث سیاسی غلبہ ختم ہو جانے کے باوجود بھی ہماری ذہنی مرعوبیت اور غلامی میں کمی ہونے کے بجائے روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دراصل ہمارا نصاب اور نظامِ تعلیم انہی فکری اساسات پر مبنی ہے جو ملحدانہ اور مادہ پرستانہ ذہنیت وجود میں لاتی ہیں' ان کی نشوونما کرتی ہیں اور مسلمان نما ملحدوں کی معاشرے میں کثرت کا باعث بنتی ہیں۔

ایک مؤحّد کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے؟

سورۂ حٰم السجدۃ کی آیت ۳۳ بڑی پیاری اور مہتم بالشان آیت ہے' فرمایا :

﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ ﴾

"اس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہو اور اس کا عمل بھی صالح ہو اور کہے میں بھی فرماں برداروں میں سے ہوں۔"

یوں تو سب کے پاس زبانیں ہیں اور آج کل قلم ہیں اور چھاپنے کے لئے اخبارات و رسائل ہیں۔ اخبارات اور رسائل اب انڈسٹری کی صورت اختیار کر چکے ہیں' یہ صحافت نہیں رہی' صحافت کا نام خواہ مخواہ بدنام ہو رہا ہے' یہ ایک کاروبار ہے۔ جس طرح ایک کاروبار اور انڈسٹری کا کام یہ ہے کہ معاشرے میں جس چیز کی طلب ہو اسے وہ مہیا اور پیدا کریں گے' یا پھر کسی ایسی چیز کی معاشرے میں مانگ (demand) پیدا کریں گے جس میں ان کو غیر معمولی منفعت کا یقین ہو' چاہے وہ شے نفسانی خواہشات کو مہمیز دینے والی ہی کیوں نہ ہو' پھر اس کو سپلائی کرنے کے لئے مسابقت کریں گے۔ اس لئے کہ معاشرے میں طلب اسی کی ہے۔ انہیں تو اپنا پرچہ بیچنا ہے' پیسہ کمانا ہے۔ اس کے سوا ان کے سامنے کوئی اصول نہیں' کوئی اعلیٰ قدر نہیں' کسی ذمہ داری کا احساس نہیں۔ جو کسی نے لکھ کر بھیج دیا شائع کر دیا۔

پرچے کا پیٹ بھرنا ہے۔ قارئین کی تفریح اور دلچسپی کا سامان مہیا کرنا ہے۔ کچھ نہیں سوچتا کہ لکھنے والا کفر لکھ رہا ہے' شرک لکھ رہا ہے' فحش لکھ رہا ہے' اللہ کے دین کا مذاق اڑا رہا ہے' شعارِ دینی کا تمسخر اور اقدارِ دینی کا استہزاء کر رہا ہے۔ قرآنی آیات کے تراجم و مطالب میں تحریف کر رہا ہے اور احادیث کو بازیچۂ اطفال بنا رہا ہے۔ پھر اخبارات و رسائل میں کثرت کے ساتھ لوگوں کی نگاہوں کو دعوتِ گناہ دینے والی تصاویر شائع کی جا رہی ہیں۔ انہیں زیادہ سے زیادہ دیدہ زیب اور دلکش بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس ملک میں دھڑلّے سے ہو رہا ہے جس کے قیام کا مقصد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بتایا گیا تھا اور جس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اس دور میں بھی دعوتیں بہت سی ہیں' زبان بھی ہے' قلم بھی ہے۔ جو جس کے جی میں آ رہا ہے کہہ رہا ہے اور لکھ رہا ہے۔ لیکن فرمایا: اس شخص سے بہتر بات کس کی ہو گی جو اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہو' لوگوں کو بلا رہا ہو اور اس کے ساتھ اس کا عمل بھی دعوت کی مناسبت سے صالح ترین اور خلوص و اخلاص پر مبنی ہو۔ وہ خود اس پر کاربند ہو۔ یہ نہ ہو کہ اوروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت والا معاملہ ہو رہا ہے۔ بلکہ نقشہ یہ ہو کہ جو بات وہ کہہ رہا ہو اس پر سرتاسر خود عامل بھی ہو۔

یہ مفہوم و مطلب ہوا ان دو باتوں کا کہ: ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ ـــــ آگے تیسری بات یہ فرمائی: ﴿وَقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ○﴾ "اور کہے میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں"۔ یعنی کوئی نیا فرقہ نہ بنایا جائے' بلکہ کہا جائے کہ میں بھی اللہ کے فرماں برداروں میں سے ایک ہوں' یعنی میں بھی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے پیروکاروں اور اللہ کی توحید پر ایمان رکھنے والوں میں سے ایک ہوں' میں بھی یومِ جزا کا یقین رکھنے والوں میں سے ایک ہوں ـــــ ان ہی باتوں کے اقرار کا نام اسلام ہے۔ اپنا ایک علیحدہ تشخص بنانا اور مسلمانوں میں ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈال دینا' اس سے بچنا چاہئے۔

اجتماعی زندگی میں توحید کے تقاضے اور اقامتِ دین کی فرضیت

انفرادی توحید سے عملی توحید کی طرف پیش رفت کے ضمن میں دعوت الی اللہ کا مرحلہ سورۂ حٰم السجدۃ میں بیان ہوا۔ اب آیئے سورۃ الشوریٰ کی طرف جہاں اجتماعی زندگی اور معاشرتی نظام میں بھی توحید ہی کے روح رواں ہونے کا تقاضا ہے۔

آیت ۱۳ سورۃ الشوریٰ کی مرکزی آیت ہے۔

﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ○ ﴾

(الشوریٰ : ۱۳)

﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ ﴾ "(اللہ نے) مقرر کیا ہے تمہارے لئے دین"۔ یہاں پوری امت سے خطاب ہے کہ تم سب کے لئے یہی دین (اسلام) مقرر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا : ﴿ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾ "بے شک اللہ کے نزدیک دین تو صرف اسلام ہے۔"

اُمّت کا جامع اور ہمہ گیر مفہوم

واضح رہے کہ صرف ہم ہی حضور ﷺ کی امت نہیں ہیں' بلکہ نبی اکرم ﷺ کی اُمّتِ دعوت تو پوری نوعِ انسانی ہے۔ آپ تا قیامِ قیامت ہر زمان و مکان کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ از روئے آیاتِ قرآنیہ : ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ اور ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ ﴾ ــــــ لہٰذا

پوری نوعِ انسانی نبی اکرم ﷺ کی "اُمّتِ دعوت" ہے۔ جن لوگوں نے آنحضور ﷺ کی دعوت کو قبول کرلیا یا آئندہ کریں گے وہ "اُمّتِ اجابت" میں شامل ہیں یا ہو جائیں گے۔ امت اجابت کے معنی ہوں گے تصدیق و تسلیم کرنے والی اُمّت —— ہمارا حال کچھ بین بین ہے۔ عملاً تو ہم نے قبول کیا ہوا نہیں ہے۔ ہم نام کے اور نسلی مسلمان ہیں' اِلاَّ مَاشَآءَ اللّٰہُ۔ ہماری عظیم اکثریت فرائض دینی کی تارک اور شعائرِ دینی کی پابندی سے عاری ہے۔ نفس پرستی' زرپرستی' قبرپرستی' تعزیہ پرستی اور نہ معلوم کتنی اور پرستیوں میں مبتلا ہے۔ زمانے کے چلن کی پرستش ہے۔ نظریاتی سطح پر ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نظریات ہمارے فہیم طبقے کے قلب و ذہن پر مستولی ہیں —— ان اعتبارات کے پیش نظر ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے نبی اکرم ﷺ کی دعوت پر فی الواقع اور بالفعل لبیک کہا ہے' البتہ ہم دعوے دار اس بات کے ضرور ہیں کہ ہم جیسے کچھ بھی ہیں بہرحال محمد ﷺ کے نام لیوا اور آنحضورؐ کے امتی ہیں۔

جو بھی رسول اللہ ﷺ اور قرآن حکیم کا مخاطب ہے وہ امت دعوت میں سے ہے' اور جو بھی اس دعوت پر لبیک کہہ کر اور اس کو قبول کر کے اس میں شامل ہو گیا وہ امت اجابت میں سے ہے۔ اُمّتِ اجابت کو قرآن حکیم فرقان حمید ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے خطاب کرتا ہے —— ان دونوں ہی سے سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں خطاب ہے۔

آیت کی تفہیم و تشریح

﴿شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ﴾ "(لوگو!) تمہارے لئے اللہ نے وہی دین مقرر کیا ہے" کونسا دین؟ ﴿مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا﴾ "جس کی اس نے وصیت کی تھی نوح (علیہ السلام) کو" ﴿وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ﴾ "اور جو ہم نے وحی کیا ہے (اے محمد ﷺ) آپ کی طرف" —— یہاں اِلَیْکَ واحد کا صیغہ ہے' لہٰذا مراد ہوں گے محمد ﷺ —— ﴿وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی﴾ "اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے

ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو" (عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْہِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ)۔ یہاں پانچ رسولوں کا ذکر آیا ہے' نبی اکرم ﷺ کا اور حضرات نوح' ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم الصلاۃ والسلام کا۔ اور یہی وہ پانچ رسول ہیں جن کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ اولوالعزم مِنَ الرُّسل ہیں۔ بعض علماء اس فہرست میں حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کو بھی شامل کرتے ہیں' لیکن علمائے سلف کی اکثریت کا رجحان ان ہی پانچ رسولوں کی طرف ہے جن کا ذکر یہاں آیا ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر حضور ﷺ سے خطاب کرکے فرمایا گیا ہے : ﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ "پس (اے محمد ﷺ!) آپ صبر کیجئے جیسے (ہمارے) باہمت اور صاحب عزیمت رسول صبر کرتے رہے ہیں"۔ یہاں اولوالعزم رسولوں سے یہی رُسل مراد ہیں۔ آیت کے اس ٹکڑے میں اہم بات یہ بیان ہوئی کہ ان سب رسولوں کا دین ایک ہی ہے۔ جو دین جناب محمد ﷺ لے کر آئے وہی دین لے کر آئے حضرت نوح علیہ السلام' حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ پس دین میں کوئی فرق نہیں۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ رسولوں کی شریعتیں مختلف رہی ہیں' اس میں کوئی شک نہیں۔ نماز کی جو شکل ہمارے یہاں ہے یہ شکل شریعت موسوی میں نہیں تھی۔ روزے کے جو احکام ہمارے یہاں ہیں وہ بنی اسرائیل کے روزوں کے احکام سے مختلف ہیں۔ لہٰذا شریعتوں میں فرق رہا ہے۔ البتہ دین ایک ہی رہا ہے۔ یہ بات اچھی طرح نہ سمجھیں گے تو "اَقِیْمُوا الدِّیْنَ" کا حقیقی مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس لئے اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔

جملہ انبیاء و رُسل کا دین ——— دینِ توحید

تمام انبیاء و رُسل کے مشترک دین کو واقعتاً ایک لفظ سے تعبیر کریں گے تو وہ ہو گا "دینِ توحید"۔ حضرت نوح کا دور ہو' حضرت ابراہیم کا دور ہو' حضرت موسیٰ اور

حضرت عیسیٰ کا دَور ہو (علیہم الصلوٰۃ والسلام) اور نبی خاتم الرسل آخر الزمان جناب محمد ﷺ کی دعوت ہو‘ ان سب کا دین ایک ہی رہا ہے اور وہ ہے دین توحید۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب نبی اکرم ﷺ تک ہر نبی اور رسول اسی دعوتِ توحید پر مامور ہوتے رہے ہیں۔ توحید کی دعوت ایک نقطۂ واحدہ ہے جو سب کی دعوت میں مشترک ہے۔ اس میں کسی دَور میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ توحید کیا ہے! یہ کہ انسان کو ہر معاملہ میں اللہ کا حکم ماننا ہے‘ اس کی ہدایت پر چلنا ہے۔ یہی تاکید جنت سے حضرت آدم علیہ السلام کے ہبوطِ ارضی کے موقع پر کر دی گئی تھی : ﴿ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾ (البقرۃ:۳۸) توحید کا اصل تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت اور اوامر و نواہی کے مطابق اس دنیا کی زندگی بسر کی جائے۔ تمام انبیاء و رُسل کی دعوت کا مرکزی نقطہ یہی توحید رہا ہے ـــــ قرآن مجید میں جن انبیاء و رُسل کا ذکر آیا ہے سب کی دعوت یہی ملے گی کہ : ﴿ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ﴾

شریعتیں جُدا رہی ہیں

مختلف رسولوں کے دَور میں شریعت کے احکام بدلتے رہے ہیں۔ اس ضمن میں اللہ کا حکم ایک وقت میں ایک ہے‘ دوسرے وقت میں دوسرا ہے‘ لیکن توحید وہی ہے۔ اس وقت اس حکم کی اطاعت کر لینا توحید تھی‘ اس وقت اس حکم کی تعمیل کرنا توحید ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے مختلف شریعتوں کے فرق کو بیان کرنے کے بجائے خود نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے ایک مثال پیش ہے جس سے ان شاء اللہ بات واضح طور پر سمجھ میں آ جائے گی۔ ہجرت کے بعد تقریباً سولہ مہینے آنحضور ﷺ نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی‘ تا آنکہ حکم آ گیا : ﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ "پس آپ پھیر دیجئے اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف"۔ اس پر بعض صحابہ کرامؓ میں ایک بے چینی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس

لئے کہ ان کو خوب اندازہ تھا کہ نماز تو عماد الدّین ہے' دین کا ستون ہے' رکنِ رکین ہے' بلکہ ایمان اور کفر میں امتیاز کرنے والی چیز درحقیقت یہ صلوٰۃ ہے' اس کی دین میں بہت اہمیت ہے۔ ان کو خیال آیا کہ اگر سولہ مہینے ہم نے غلط رخ پر نماز پڑھی تو ہماری ان نمازوں کا کیا ہو گا؟ دوسرے یہ کہ اس دَوران جن مسلمانوں کا انتقال ہو گیا اب ان کا کیا ہو گا؟ پس منظر میں یہ تشویش موجود تھی جس کے ازالے کے لئے اسی مقام پر یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ اِيْمَانَكُمْ ﴾ "اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان ضائع کرنے والا نہیں ہے" فکر نہ کرو۔ اس وقت تم نے اگر بیت المقدّس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی تو حکمِ خداوندی وہی تھا۔ اس وقت اسی اللہ کا حکم یہ ہے کہ مسجدِ حرام کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھو۔ تو اس وقت توحید کا تقاضا وہ تھا' اس وقت اسی توحید کا تقاضا یہ ہے۔ گویا حکم بدل سکتا ہے' اصول نہیں بدلے گا۔ اصول یہ ہے کہ اللہ کے حکم پر چلنا ہے۔ جس وقت جو حکم ہے اسے ماننا ہو گا۔

اسی طریقے سے دوسری مثال سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں دیکھئے۔ مکی دَور میں حکم ہے کہ مشرکین اگر تمہیں دہکتے انگاروں پر لٹا رہے ہیں تو جھیلو' برداشت کرو' ہاتھ مت اٹھاؤ۔ اس وقت اس حکم کی اطاعت کرنا اللہ کی اطاعت تھی۔ جبکہ مدنی دَور میں آ کر حکم ہوا: ﴿ وَقَاتِلُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ ﴾ "اور جنگ کرو اللہ کے راستے میں ان سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں"۔ اب اس حکم پر عمل کرنا توحید ہے' اللہ کی اطاعت ہے۔ اللہ کی اطاعت وہاں وہ تھی' یہاں یہ ہے۔ اللہ کی اطاعت کا اصول قائم رہے گا اگرچہ حکم بدل گیا ____ حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت کچھ اور تھی جس کا ہمارے پاس کوئی ریکارڈ نہیں۔ ہمارے پاس اگر ریکارڈ ہے تو وہ شریعت موسویؑ کا ہے۔ اور ان شریعتوں کے فرق کو عام طور پر لوگ جانتے ہیں۔ پس شریعتیں بدلی ہیں' جدا رہی ہیں۔ قرآن مجید میں ایک جگہ یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ﴿ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ﴾ "ہم نے تم (انسانوں) میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور راہِ عمل مقرر کی"۔ سابقہ

اُمّتیں اگر ان کو دی ہوئی شریعتوں پر کاربند رہیں تو انہوں نے توحید کا تقاضا پورا کیا۔
اب شریعتِ محمدی ـــــ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ـــــ پچھلی تمام شریعتوں کی ناسخ
ہے۔ اب اس پر چلنا توحید اور اطاعت الٰہی کا تقاضا ہے۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ تورات کا ایک نسخہ لے آئے تھے اور اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھنا شروع کیا۔ (میرا یہ گمان ہے کہ وہ کسی مسئلہ میں دلیل کے طور پر تورات کو پڑھ رہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا رہے تھے) وہ تو پڑھنے میں لگے رہے اور ان کو اندازہ نہیں ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر ناراضگی کے آثار ہیں' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ قریب تھے' انہوں نے حضرت عمرؓ کو ٹوکا "دیکھتے نہیں ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کا کیا حال ہے!" ـــــ حضرت عمرؓ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور ان کو حضورؐ کے چہرۂ انور پر خفگی کے آثار نظر آئے تو فوراً ان کی زبان سے یہ الفاظ جاری ہو گئے : "رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلاً وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا" تین بار انہوں نے ان الفاظ کا اعادہ کیا۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ فرو ہوا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے عمر! اگر موسیٰؑ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اطاعت کئے بغیر چارہ نہیں تھا" اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ اس لئے کہ تمام سابقہ شریعتیں شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آنے کے بعد منسوخ ہو چکی ہیں ـــــ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اگرچہ انبیاء و رسل علیہم السلام کی شریعتیں مختلف رہی ہیں' تاہم دین ایک ہی رہا ہے اور وہ ہے "دین توحید"۔

دین اور شریعت میں ربط و تعلق

اب دیکھیں کہ دین اور شریعت میں کیا ربط و تعلق ہے۔ دیکھئے جدید سیاسیات میں دو اصطلاحات رائج ہیں۔ ایک دستور (Constitution)' دوسری قانون (Law)۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ دستور (Constitution) وہ دستاویز ہے جو کسی بھی ملک

کے نظام کو متعین کرتی ہے۔ اساسی دستور میں طے ہوتا ہے کہ اس ملک میں حاکمیت کس کی ہے۔ حاکم (Sovereign) کون ہے! اور حاکمیت کس طرح استعمال (channelize) ہوگی! وہ روبعمل (exercise) کس طور پر ہوگی۔ اس دستور کے تحت قانون سازی کا طریقہ کیا ہوگا! اس میں ردوبدل کیسے ہوگا! انتظامیہ اور عدلیہ میں باہمی ربط و تعلق کیا ہو گا! ایک دوسرے کے محاسبہ اور توازن (checks and balances) کا نظام کیا ہوگا! ان بنیادی مسائل کے لئے رہنمائی دینے والی دستاویز اساسی دستور کہلاتی ہے۔ ہر ملک کے دستور میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اساسی دفعات بہت پائیدار اور مضبوط ہوں۔ چونکہ دستور میں بار بار ترمیم مناسب نہیں ہوتی لہٰذا تبدیلی کا طریقہ (process) مشکل ترین رکھا جاتا ہے۔ اس دستور کے تحت حسب ضرورت اکثریت کی رائے سے قانون سازی ہوتی رہتی ہے' اور قانون صرف ۴۹ اور ۵۱ فیصد آراء کے فرق سے ہر وقت تبدیل بھی ہو سکتا ہے۔ ایک وقت میں لیجسلیٹو اسمبلی یا پارلیمنٹ ایک قانون منظور کرتی ہے اور دوسرے وقت میں اس کو تبدیل کر دیتی ہے یا اس میں ترمیم (amendment) کر دیتی ہے۔ وہ ترمیم چھپ جاتی ہے اور وکلاء حضرات اس طرح قانون کی کتاب میں چیپیاں لگاتے رہتے ہیں ــــ ان دونوں اصطلاحات سے یہ بات سمجھ لیجئے کہ دستور کی حیثیت ہے دین کی اور قانون کی حیثیت ہے شریعت کی۔

لفظ دین کا مفہوم

آگے بڑھنے سے قبل لفظ دین کے مفہوم کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا جائے جس کی تشریح ابتدائی گفتگو میں مؤخر کی گئی تھی۔ عربی میں دین کے لغوی معنی ہیں "بدلہ"۔ ظاہر ہے کہ بدلہ کسی کام کے نتیجہ کے طور پر ملتا ہے۔ اچھے کام کا اچھا اور برے کام کا برا بدلہ ــــ لہٰذا لفظ دین میں جزا و سزا کا مفہوم پیدا ہوا۔ اس مفہوم سے لفظ دین میں قانون اور ضابطہ کا تصور شامل ہوا' کیونکہ جزا اور سزا مستلزم ہے کسی

قانون اور ضابطہ کو۔ اس تصور کے مقتضیات و لوازم کے طور پر اسی لفظ دین میں ایک مقنن اور مُطاع کا مفہوم داخل ہوا۔ اب بدلہ 'جزا و سزا' قانون و ضابطہ اور مقنن و مُطاع کے تمام مفاہیم کو جمع کیجئے تو حاصل جمع ہو گا اطاعت۔ لہٰذا ان تمام مطالب و مفاہیم اور تصورات کے اجتماع سے قرآن مجید کی اصطلاح "دین" بنی۔ دین کے معنی ہوئے ایک دستور' ایک پورا نظامِ حیات' ایک مکمل ضابطۂ زندگی جس میں ایک ہستی یا ادارے کو مطاع' مقنن اور حاکم مطلق تسلیم کر کے اس کی جزاء کی امید اور سزا کے خوف سے اس کے عطا کردہ یا جاری و نافذ کردہ قانون اور ضابطہ کے مطابق اس ہستی یا ادارے کی کامل اطاعت کرنا۔

ان تمام مفاہیم کو قرآن مجید میں ان الفاظ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے : ﴿ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ﴾ بلاشبہ اللہ کا پسند کردہ نظامِ حیات تو اسلام یعنی مکمل فرماں برداری ہے۔ یہاں دین اور اسلام کے فرق کو بھی سمجھ لیجئے۔ "الدِّین" کے معنی یہاں ہیں "نظامِ حیات و اطاعت" اور الاسلام کے معنی ہوں گے تابعداری اور فرمانبرداری کرتے ہوئے زندگی بسر کرنا۔ نظامِ حیات اور دستور کے معنی میں یہ لفظ "دین" سورۃ النصر میں استعمال ہوا : ﴿ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ○ ﴾ غیر اللہ کے بنائے ہوئے نظامِ حیات پر بھی اسی "دین" کی اصطلاح کا اطلاق ہو گا۔ جیسے سورۃ یوسف میں بادشاہ کے رائج نظام کے لئے "دینِ المَلِكِ" استعمال ہوا' کیونکہ ملوکیت میں حاکمیت مطلقہ بادشاہ کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور وہ کسی تحدید کا پابند نہیں ہوتا۔

دستور و قانون کا باہمی تعلق

اب پھر رجوع کیجئے اس بات کی طرف کہ دستور تو اصل میں نظام کو طے کرتا ہے اور اس نظام کے تحت قانون کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ لہٰذا دستور کی حیثیت ہے دین کی اور قانون کی حیثیت ہے شریعت کی۔ دستور طے کرتا ہے کہ حاکمیت کس کی ہے' اطاعتِ مُطلقہ کس کی ہے! قانون سازی کا آخری اختیار کس کے

ہاتھ میں ہے! اللہ کے دین میں حاکمیت مطلقہ صرف اور صرف اللہ کے لئے ہے۔ اطاعتِ مُطلقہ کی سزاوار اسی کی ذات عزّوجلّ ہے۔ اس کی قائم کردہ حدود کے اندر اندر رہتے ہوئے اسلامی ملک کی پارلیمنٹ کو قانون سازی کا حق حاصل ہے۔

جمہوریت

دورِ حاضر میں سب سے زیادہ مقبول اور روبعمل نظام جمہوریت ہے۔ گویا آج کل سب سے زیادہ رواں جمہوریت کا سِکّہ ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ؏ "سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ!" یہاں "آتا" کو "آیا" سے بدل دیجئے تو یہ دَور جمہوریت کا دَور ہے۔ یہ بھی ایک دین ہے' دین جمہور۔ اس کی اصل یہ ہے کہ حاکمیت مطلقہ عوام کی ہے۔ عوام کے منتخب کردہ نمائندے جو چاہیں گے قانون بنائیں گے۔ انہیں اختیار ہے کہ شراب پر پابندی لگائیں یا اسے قومی مشروب قرار دیں۔ ان کو اختیار ہے کہ زنا پر کوئی سزا طے کریں یا اس کی کھلی چھوٹ دے دیں۔ اسی جمہوریت نے یہ گل کھلائے ہیں کہ بعض مغربی ممالک میں فعلِ قومِ لوط کو نہ صرف جائز قرار دیا گیا ہے' بلکہ اس فعل کو اس طرح قانونی تحفظ دیا گیا ہے کہ دو مَرد بھی آپس میں شوہر اور بیوی کا رشتہ قائم کر کے رہ سکتے ہیں' قانون ان سے کوئی تعرض نہیں کرے گا۔ چونکہ ان کا قانون اس جوڑے کو جائز رشتہ ازدواج میں منسلک قرار دیتا ہے لہٰذا ان پر شوہر اور بیوی کے تمام حقوق و فرائض کا اطلاق ہو گا۔ یہ ہے جمہوریت جس میں حاکمیتِ مُطلقہ عوام کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے نمائندے جو چاہیں قانون بنائیں' ان پر کوئی تحدید نہیں ہے۔

دین اللہ

دین الملک اور دین جمہور کے مقابلے میں دین اللہ' یعنی دین اسلام کیا ہے؟ وہ یہ کہ مطاعِ مطلق اللہ ہے۔ قانون سازی کا مطلقاً اختیار اللہ کو ہے۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ﴾ "حکمرانی اور فرماں روائی کا

کلیتاً اختیار صرف اللہ کے لئے ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی بندگی کی جائے گی' اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں ہوگی۔ اسی طرزِ عمل اور رویّہ کا نام دین قیم ہے"۔ اسلامی مملکت میں اللہ کی حاکمیت مطلقہ تسلیم کی جائے گی اور اللہ کے نازل کردہ دین و شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے حسب ضرورت قانون سازی ہوتی رہے گی۔ اصولِ دین سے کسی حال میں سرمو انحراف نہیں کیا جائے گا۔

ہمارے دستور کی قراردادِ مقاصد

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ اور چند دوسرے اہل علم و دانش کے تعاون سے مرتب کردہ قراردادِ مقاصد ۱۹۴۹ء میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی تھی جو ۱۹۷۳ء کے دستور تک ہر دستور میں بطورِ افتتاحیہ (Preamble) شامل ہے۔[1]

اس قرارداد میں یہ بات طے کی گئی تھی کہ اس سلطنت خداداد میں حاکمیت اللہ کی ہے اور عوام کے منتخب نمائندے اس کے نائب کی حیثیت سے امور و کاروبارِ حکومت چلائیں گے۔ وہ بہت اہم اور بڑا فیصلہ تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ فیصلہ دلی آمادگی سے نہیں کیا گیا تھا۔ یہ تو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی شخصیت' ان کی علمیت' ان کی وجاہت اور ان کا پاکستان کی تحریک میں بھرپور حصہ' پھر عوام و خواص میں ان کی عزت و احترام اور ان کا اثر و رسوخ' ان سب باتوں کا رعب اتنا تھا۔ پھر یہ کہ نواب لیاقت علی خان مرحوم خود بھی مولانا کے کچھ زیر اثر تھے' لہٰذا قراردادِ مقاصد پاس ہو گئی' ورنہ مجھے امید ہے کہ اس مجلس میں چند لوگ ایسے ضرور ہوں گے جن کو یاد ہو گا کہ قراردادِ مقاصد کے منظور ہونے کے بعد دستور ساز اسمبلی میں کچھ نام نہاد مسلمانوں ہی نے کھڑے ہو کر یہ کہا تھا کہ اس قرارداد کے پاس ہونے پر آج ہماری گردنیں شرم کے مارے جھک گئی ہیں' آج ہم مہذب دنیا کو منہ دکھانے کے قابل

---

[1] صدر ضیاء الحق مرحوم نے قراردادِ مقاصد کو دستور میں دفعہ ۲۔الف کی حیثیت سے شامل کر دیا تھا۔

نہیں رہے۔ حقیقت یہی ہے کہ بات چونکہ دل سے نہیں نکلی تھی لہٰذا اثر انگیز نہیں ہوئی۔ اندر خاص شخصیتوں کے دباؤ تھے، پھر خارج میں جماعت اسلامی کی برپا کردہ اسلامی دستور کی تدوین کے لئے کافی مؤثر تحریک تھی، جس کے نتیجہ میں اسمبلی میں خطوط، پوسٹ کارڈز اور تاروں نیز مختلف پلیٹ فارموں سے منظور شدہ مطالبوں کی قراردادوں کی نقول سے بوریوں کی بوریاں بھر گئی تھیں اور ان کا تانتا بندھا ہوا تھا، ملک نیا نیا بنا تھا، عوامی دباؤ کا بھی یہ نیا تجربہ تھا، لہٰذا برسر اقتدار لوگ اس عوامی تحریک سے بھی کافی مرعوب ہو گئے تھے۔ رائے عامہ کا ظہور جس قدر بڑے پیمانے پر ہوا تھا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ قراردادِ مقاصد منظور تو ہو گئی، لیکن جیسا کہ مَیں نے عرض کیا کہ یہ کام خارجی دباؤ کے تحت ہوا تھا، اصل میں دل سے یہ بات نہیں نکلی تھی، لہٰذا وہ صفحہ قرطاس کی زینت تو بن گئی لیکن اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جو پیش رفت ہونی چاہئے تھی وہ نہیں ہوئی۔ نہ اس وقت ہوئی نہ آج تک ہوئی ہے۔

ایک کثیفہ

اس ضمن میں ایک لطیفہ بلکہ کثیفہ ملاحظہ ہو۔ ایک صاحب جو اس وقت اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل تھے اور مجھ سے بڑے تھے، اب بھی حیات ہیں اور ایک نامور سیاسی لیڈر کی حیثیت سے معروف ہیں، ہم دونوں ساتھ ساتھ لاہور کی مال روڈ پر جا رہے تھے تو ایک بڑی سی کار پاس سے گزری جس میں ایک بہت لمبی داڑھی والے ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے توجہ سے دیکھا کہ کون ہیں! انہوں نے کہا کہ کیا دیکھتے ہو؟ یہ "قراردادِ مقاصد" ہے۔ میں بڑا حیران ہوا اور میں نے کہا کیا کہہ رہے ہو؟ وہ کار والے صاحب سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان کو لوگ "قراردادِ مقاصد" کہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کیوں؟ بولے "جس طرح قراردادِ مقاصد کی ہمارے ملک میں کوئی حیثیت نہیں ہے ویسے ہی ان صاحب کے کردار میں اس داڑھی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اپنے کردار کے لحاظ سے یہ نہایت

بدنام شخص ہے۔ دینداری کے اظہار کے لئے بڑی سی داڑھی رکھی ہوئی ہے' بالکل اس طرح جیسے قرارداد مقاصد کی حیثیت محض ایک دکھاوے کی چیز کے سوا کچھ نہیں"۔ ان کی بات صدفی صد درست ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ پینتیس[1] سال گزر چکے ہیں' اور اس عرصہ میں اس قرارداد پر جو عمل ہوا ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ تاہم قرارداد مقاصد کی یہ دفعہ جو ہر دستور میں محض رہنما اصول (Directive Principle) کے طور پر درج ہوتی چلی آرہی ہے اصولی طور پر بہت اہم ہے :

(No legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah)

"کوئی ایسی قانون سازی نہیں کی جائے گی جو قرآن و سنت کے خلاف ہو"۔

اسلامی نظام کے مقتضیات

اگر قرارداد مقاصد اور یہ رہنما اصول ہمارے دستور کی نافذ العمل دفعہ (Operative Clause) بن جائے اور یہ دونوں واقعی اخلاص کے ساتھ صاحب اقتدار حضرات کے دلوں میں اتر جائیں' پھر ملک کی تمام ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کو کھلا اختیار دے دیا جائے کہ اس ملک کا رہنے والا ہر مسلمان اس دفعہ کے تحت جس قانون کو بھی چیلنج کرے کہ یہ قرآن و سنت کے خلاف ہے تو وہ عدالتیں اس قانون کا جائزہ لیں اور اس کے بارے میں فیصلہ دیں ـــــ یہ دونوں چیزیں ملک کے دستور اور نظام کو اسلامی بنانے کے لئے کفایت کریں گی۔

باقی رہی یہ بات کہ انتخابات کا طریقہ کیا ہو! وہ جماعتی بنیاد پر ہو' متناسب نمائندگی کے اصول پر یا غیر جماعتی ہو؟ ملک کا نظام پارلیمانی ہو یا صدارتی ہو' وحدانی ہو یا وفاقی یا الحاقی ہو؟ یہ سارے مسائل مباحات کے دائرے کے ہیں۔ ہمارے ملک کے حالات کے اعتبار و لحاظ سے جو طریقہ مناسب نظر آئے اسے اختیار کر لیا جائے۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ خطاب ۱۹۸۳ء کا ہے۔

اصل چیز یہ ہے کہ ملک کا نظام توحید پر مبنی ہو۔ نظری طور پر تسلیم کیجئے اور عمل میں اس کا مظاہرہ کیجئے کہ حاکمیت کا اختیار صرف اللہ کا ہے۔ نظری طور پر یہ بات قراردادِ مقاصد میں موجود ہے اور عملاً اس رہنما اصول کو نافذ العمل بنانے کی ضرورت ہے کہ اس میں ملک میں قرآن و سنت سے متصادم کوئی قانون سازی نہیں کی جاسکے گی۔

قانون سازی کا ہمیں اختیار ہے' لیکن یہ اختیار محدود ہے۔ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے اندر اندر اور ان کی روح کے مطابق قانون بنا سکتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام میں ردّ و بدل کرنے کے ہم ہرگز مجاز نہیں ہیں' نہ ہم ان سے تجاوز کرسکتے ہیں : ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ "یہ اللہ کی حدود ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو" اور: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ "یہ اللہ کی حدود ہیں' ان کے قریب نہ پھٹکو"۔[1] اس دائرے کے اندر آپ قانون بنائیے۔ اس کے لئے بھی قرآن نے ان الفاظ مبارکہ میں واضح ہدایت دے دی ہے ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ لہٰذا ضروری ہے کہ معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں۔

---

[1] ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ بندۂ مؤمن کے اختیار کی کیفیت اس گھوڑے کے مانند ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہو۔ اب جتنی لمبی رسی ہے اسی قدر وہ اس کھونٹے کے چاروں طرف جاسکے گا' اس رسی سے تجاوز نہیں کرسکے گا۔ یہی طرزِ عمل ایک مؤمن بندے کا ہونا چاہئے۔ (او کما قال) اس سے ایک صحیح اسلامی ریاست کی حدود اختیارات کو سمجھا جاسکتا ہے — اسلامی ریاست میں اختیارات کی حد بندی کے لئے سورۃ الحجرات کی یہ آیت کریمہ رہنمائی کرتی ہے کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۝﴾ "اے اہل ایمان! اللہ اور اس کے رسولؐ کے آگے (یعنی ان کے احکام سے) پیش قدمی نہ کرو اور اللہ کی نافرمانی سے بچو۔ اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔ اس آیت کی رو سے ایک اسلامی ریاست کو لازماً اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے تابع ہو کر کاروبارِ حکومت چلانا ہوگا۔ (مرتب)

قابلِ صد افسوس بات

آپ کو معلوم ہے کہ اس دَور میں شرعی عدالتیں بنی ہیں' لیکن ان کا حال کیا ہے؟ان کے بھی ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ان کو حکم ہے کہ کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ اپنے ہاتھ بندھے رکھو۔ فلاں فلاں قوانین کی طرف نگاہ نہ اٹھانا۔ عائلی قوانین ان شرعی عدالتوں کے حیطۂ اختیار سے باہر ہیں۔ان پر فیصلہ کرنے کی یہ عدالتیں مجاز نہیں کہ ان میں شریعت کے خلاف کون کون سی دفعات ہیں۔ ان عائلی قوانین کو صاحب اقتدار حضرات کا تحفظ حاصل ہے۔چونکہ ڈر ہے کہ اگر ان میں سے خلافِ شرع دفعات حذف کر دی گئیں تو مغرب زدہ خواتین ناراض ہو جائیں گی۔ گویا ان کی ناراضگی کا اللہ کی ناراضگی سے زیادہ خوف ہے۔یایوں کہہ لیں کہ ان کی رضااللہ کی مرضی و رضا سے زیادہ عزیز ہے۔ ان شرعی عدالتوں کو اس امر کا پابند بھی کر دیا گیا ہے کہ یہ مالی قوانین کے بارے میں بھی فیصلے دینے کی مجاز نہیں ہیں کہ کون سے قوانین اور طور طریقے خلافِ اسلام ہیں۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ اہم ترین نظام تو مالیات کا نظام ہی ہوتا ہے۔ آج کی دنیا میں سارا دارومدار تو معاشی نظام پر ہے۔وہ طے کرتا ہے کہ پورا نظام کن اصولوں پر چلے گا۔

آپ کو یادنیٰ تامل نظر آجائے گا کہ ہمارے پورے نظامِ معیشت کا دارومدار حرام پر ہے۔ہماری تمام بڑی بڑی صنعتیں اور ہماری تمام برآمدی ودرآمدی تجارت سود کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ ہماری زمین یعنی کاشت کاری کا اکثروبیشتر بندوبست جاگیرداری اور زمینداری کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ایک ہے صنعت وتجارت کا سود اور ایک ہے زمین کا سود۔ معیشت کا کل کا کل معاملہ سود کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ لیکن شرعی عدالتوں کے ہاتھ باندھ دیئے گئے ہیں کہ وہ ان مسائل کے متعلق کوئی فیصلہ (Verdict) نہیں دے سکتیں۔ہو سکتا ہے کہ چند اور بھی مسائل ہوں جو ان عدالتوں کے حیطۂ اختیار سے باہر رکھے گئے ہوں۔ بہرحال عائلی قوانین اور مالی قوانین پر یہ عدالتیں کسی غوروفیصلہ کی مجاز نہیں ہیں۔ ان امور کو اگر دین کے تابع

نہیں کیا گیا تو گویا بنیادی باتوں ہی سے اعراض و گریز کیا جا رہا ہے۔ پھر اسلام آئے گا تو کیسے آئے گا!! اگر اسلام کو فی الواقع لانا ہے تو ان سب کو بدلنا ہو گا۔

آیت کی مزید توضیح و تشریح

اب آیئے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کی طرف۔ اس آیت کی ابھی تک صرف دو باتوں کی شرح ہوئی ہے۔ ایک تو یہ کہ ان پانچ رسولوں کا دین ایک ہی ہے اور یہ پانچوں چوٹی کے رسول ہیں ـــــ معلوم ہوا کہ تمام انبیاء و رُسل کا دین ایک ہی رہا ہے' از آدم علیہ السلام تا ایں دم' دین الٰہی ایک ہے۔ یہ دین کیا ہے؟ یہ ہے ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ﴾ انفرادی سطح پر اور اجتماعی سطح پر یہ بات مانو کہ اللہ ہی حاکم مطلق ہے۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ اسی کے قانون کی تنفیذ ہو۔ جہاں اس نے آزادی دے رکھی ہو وہاں تم حدود میں رہ کر قانون بنا سکتے ہو۔ یہ اسی کی دی ہوئی آزادی ہے' لیکن اس کی مقرر کردہ حدود سے ہرگز تجاوز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان میں ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہو گا دین کو قائم کرنا۔ یہ ہے اقامتِ دین۔

اس کو سمجھنے کے لئے اب آیت مبارکہ کے اگلے حصے پر آ جایئے۔ ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ﴾ یہ دین اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کو قائم کرو۔ اس لئے تو نہیں دیا گیا کہ اس کی مدح کرو' اس کی تعریفیں کرو' اس پر کانفرنسیں کرتے رہو۔ کانفرنسیں اور محاضراتِ قرآنی ہم بھی کرتے ہیں' لیکن اگر ان کانفرنسوں اور محاضرات سے مقصود دین کو قائم کرنے کی جدّوجہد میں کام لینا ہو تو ان کا انعقاد مبارک ہے' اور اگر یہ چیزیں اپنی جگہ مقصود و مطلوب بن جائیں اور گفتن و برخاستن تک معاملہ رہے تو ان کا کوئی حاصل نہیں۔ کسی پیش نظر عظیم کام کے لئے ہو تو یہ احسن کام ہے۔ چونکہ ظاہر بات ہے کہ اس کے کچھ عملی پہلو (Practical Aspects) ہوں گے' لہٰذا اصل مقصود ہی اس کام کا صحیح مقام

متعین کرے گا ـــــ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے طور پر تبلیغ ہو رہی ہو تو وہ تبلیغ اور ہو گی۔ اور اگر تبلیغ برائے تبلیغ ہو رہی ہو تو وہ تبلیغ اور ہو گی۔ ان میں زمین و آسمان کا فرق ہو جائے گا۔ ایک ہے خالص مذہبی طرز کی تبلیغ اور ایک تبلیغ ہے انقلابی تبلیغ۔ ایک تبلیغ وہ ہے جو صرف عقیدہ کو پھیلاتی ہے' جیسے عیسائیت کی تبلیغ۔ وہاں نظام ہے ہی نہیں' دین ہے ہی نہیں' شریعت موجود ہی نہیں کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام؟ اس کے احکام موجود ہی نہیں ہیں۔ ان کے ہاں صرف عقیدہ ہے یا اخلاقیات کی کچھ تعلیم ہے۔ اخلاقیات سب کے نزدیک مشترک چیزیں ہیں۔ ان کو آفاقی اخلاقیات (Universal Ethics) کہنا بجا ہو گا۔ شریعت ان کے ہاں سرے سے ہے نہیں تو نظام کیا بنے گا! لہٰذا اس کی تبلیغ صرف عقیدے اور چند اخلاقی اصولوں کی تبلیغ ہے۔ جس طرح ایک بیل ہوتی ہے' وہ زمین پر پھیلتی ہے' سرے سے اوپر اٹھتی ہی نہیں' وہ خربوزے کی ہو' کدّو کی ہو' کسی چیز کی بھی ہو وہ زمین پر ہی رہ جائے گی' اوپر نہیں اٹھے گی۔ یہی مذہبی تبلیغ کا مزاج ہے۔ وہ زمین پر ہی پھیلتی چلی جاتی ہے۔ وہ کبھی نظام قائم نہیں کرتی۔ نظام کا قیام اس کے پیش نظر ہوتا ہی نہیں۔

اس کے برعکس انقلابی تبلیغ کسی نظام کو برپا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اس کی مثال ہمارے سامنے اشتراکی تبلیغ ہے۔ ایک اشتراکی اپنی جدّوجہد اور تبلیغ کے ذریعے اپنے نظریات کو پھیلاتا ہے' لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتا ہے' اپنا لٹریچر پھیلاتا ہے' غزلوں' نظموں' افسانوں اور بہت سے ذرائع سے وہ اپنے فکر کو پھیلانے کے لئے جدوجہد کرتا ہے' پھر اس فکر کو قبول کرنے والوں کو منظم کرتا ہے' اس لئے کہ اس کے پیش نظر انقلاب برپا کرنا ہے۔ اس کے پیش نظر ایک نظام ہے جسے وہ سمجھتا ہے کہ صحیح اور بہترین نظام ہے۔ وہ غلط سمجھتا ہے یا درست' اس سے قطع نظر وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ یہ وہ نظام ہے جو عدل پر مبنی ہے۔ وہ اس نظام کو برپا کرنے کے لئے تبلیغ کر رہا ہے۔ تو اس انقلابی تبلیغ میں اور اس مذہبی تبلیغ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حضرت محمد ﷺ کی تبلیغ کو آپ دیکھیں گے تو اس میں آپ کو دونوں پہلو نظر

آئیں گے۔ اللہ کی طرف دعوت بھی ہے' توحید کے عقیدے کی دعوت بھی ہے اور اقامتِ دین کی جدّوجہد بھی ہے' نظام کو بدلنے کی سعی و کوشش بھی ہے۔ چنانچہ آگے چل کر جب ہم اس سورۂ شوریٰ کی اگلی آیات زیر بحث لائیں گے تو ان میں ہمیں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا یہ ہدف ملے گا : ﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ﴾ "(اے محمد ﷺ!) پس آپ اسی کی دعوت دیجئے"۔ یہاں "فَلِذٰلِكَ فَادْعُ" نہایت غور اور توجّہ چاہتا ہے۔ دعوت کس چیز کی؟ دعوتِ اقامتِ دین کی ـــــ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ کی دعوت' دین کو بالفعل قائم کرنے کی دعوت۔ صرف عقیدے کی دعوت نہیں۔ ٹھیک ہے' نماز' روزے اور دوسرے نیکی کے کاموں کی دین میں بڑی اہمیت ہے' لیکن ان سب سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی توحید کو اجتماعی نظام پر قائم کرنے کے لئے ان سے مدد حاصل کی جائے ﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ ﴾ "اے ایمان والو! مدد حاصل کرو (اللہ کی راہ میں مشکلات پر) صبر سے اور نماز سے" ـــــ آگے جہاد فی سبیل اللہ کی جو چوٹی ہے' یعنی قتال فی سبیل اللہ ـــــ اس کے اعلیٰ وارفع مقام کا ذکر ان الفاظ مبارکہ سے کر دیا گیا ﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ ﴾ صبرو صلوٰۃ سے مدد کس مقصد کے لئے حاصل کرنی ہے! وہ مقصد ہے اقامتِ دین کی جدّوجہد!!

اسی کے متعلق نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا : ﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ﴾ "پس (اے نبیؐ!) اسی کی دعوت دیجئے' اور جس چیز کا آپؐ کو حکم ہوا ہے اس پر جم جایئے اور ان (مشرکوں) کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے"۔ یہ ہے اقامتِ دین ﴿ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ ﴾

تفرقہ کیا ہے؟

ایک لفظ ہے تفرقہ یا تفریق اور ایک ہے اختلاف۔ ان دونوں میں زمین و

آسمان کا فرق ہے۔ اختلاف بالکل نیک نیتی سے بھی ہو سکتا ہے۔ اختلاف جزوی ہوتا ہے۔ اختلاف کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ من دیگرم تو دیگری۔ جبکہ تفرقہ یہ ہے کہ ایک دوسرے سے کٹ جائیں' آپس میں پھٹ جائیں' ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ اختلاف تو امام ابو حنیفہ سے کیا امام شافعی نے (رحمہما اللہ) ــــــ امام ابو حنیفہؒ کے بعض فتاویٰ سے اختلاف کیا ہے خود امام موصوف کے شاگردوں نے۔ امام محمدؒ اور امام قاضی ابو یوسفؒ نے بعض مسائل میں امام صاحبؒ کی آراء سے اختلاف کیا۔ ایک امام دوسرے امام کی رائے' تعبیر اور فتویٰ سے اختلاف کر سکتا ہے۔ ایک شاگرد اپنے استاذ کی رائے سے اختلاف کر سکتا ہے۔ ان سب کی نیتیں نیک ہیں' مبنی براخلاص ہیں۔ یہ سب دینِ الٰہی کا حکم اور اس کی منشاء قیاس اور اجتہاد کے ذریعے سے معلوم کرنا چاہ رہے ہیں۔ پس اختلاف نیک نیتی سے بھی ہو سکتا ہے۔ اختلاف کوئی بری شے نہیں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسی اختلاف سے دنیا کی رونقیں ہیں۔ چنانچہ ذوق نے کہا ہے ؎

گلہائے رنگا رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے!

ایک گلاب کا پودا ہے' اس میں جو پھول لگتے ہیں وہ سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر ایک کا رنگ اور انداز جدا جدا ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک ہی طرح کے تمام انسان ہوتے' رنگ ایک' شکل و صورت ایک' ناک نقشہ ایک' تو کتنی اکتا دینے والی یکسانیت (monotony) ہو جاتی۔ ایک دوسرے کو پہچاننا مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن ہو جاتا۔

تفریق دین ایک نوع کا شرک ہے

تفرقہ کے متعلق جان لیجئے کہ امت میں تفرقہ اور دین میں تفرقہ کو شرک کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے : ﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا

لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ط ﴾ "جو لوگ اپنے دین کو پھاڑ دیں (ٹکڑے ٹکڑے کر دیں' اس میں تفرقہ ڈال دیں) اور گروہوں میں بٹ جائیں' یقیناً (اے نبیؐ!) ان سے آپؐ کا کوئی تعلق نہیں"۔ دین کو پھاڑنا کیا ہو گا؟ ـــــ نظامِ اطاعت کو تقسیم کر دینا۔ یعنی زندگی کے ایک حصہ میں اللہ کی اطاعت ہو رہی ہے اور دوسرے حصوں میں کسی اور کی اطاعت ہو رہی ہے۔ کہیں اطاعت ہو رہی ہے شریعتِ الٰہی کی اور کہیں اپنے نفس کی خواہشات کی' کہیں زمانے کے چلن اور فیشن کی' کہیں برادری کے رواج کی۔ یہ دین ہی پھاڑ دیا گیا ہے۔ یہاں "فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ" کے الفاظ نہایت قابلِ غور ہیں۔ فَرَّقَ' یُفَرِّقُ' تَفْرِیْقًا آتا ہے پھاڑ دینے' کاٹ دینے' ٹکڑے ٹکڑے کر دینے اور جدا جدا کر دینے کے معانی میں۔

دوسرا ہے تَفَرُّقٌ فِی الدِّیْنِ یعنی خود دین کے معاملے میں متفرق ہو جائیں۔ دین کے معاملہ میں متفرق ہونے کا تعلق ہے اقامتِ دین سے۔ مسلمان فرقوں میں منقسم ہو جائیں تو پھر دین کیسے قائم ہو گا؟ دین کو قائم کرنے کے لئے تو بڑی مضبوط جدّوجُہد کی ضرورت ہے۔ بڑی مجتمع قوتوں کی ضرورت ہے۔ مل جل کر کام کرنا اور زور لگانا ہو گا۔ آپ تصور کیجئے محمد ﷺ اور آپؐ کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محنت' جدوجہد اور ایثار و قربانی کا' جس کے نتیجے میں جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کا دین بالفعل قائم اور نافذ ہوا' جس کی مدح قرآن مجید جگہ جگہ کرتا ہے۔ سورۃ الفتح میں فرمایا:

﴿ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ..... ﴾

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو بھیجا ہدایت اور دین حق کے ساتھ' تاکہ اس کو پورے جنسِ دین (نظامِ اطاعت و نظامِ حیات) پر غالب کر دیں۔ اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور

جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کُفّار پر نہایت سخت اور آپس میں نہایت رحیم ہیں"۔

یہ شان نہ ہوتی تو دین قائم نہ ہوتا ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

اقامتِ دین کی فرضیت

فرمایا: ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ﴾ "دین کو قائم کرو اور اس معاملہ میں تفرقہ نہ ڈالو"۔ تم سب کا مقصود و مطلوب ایک ہو۔ تم سب کے سامنے یہی ہدف ہو کہ سب سے پہلے تو خود اللہ کا بندہ بننا ہے۔ یہ ہے انفرادی سطح پر توحید عملی۔ یہ توحید ہو گی اطاعت کو اللہ کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ پھر اجتماعی جدّوجُہد کا آغاز ہو گا دعوت الی اللہ سے اور اس کا منتہا اور مقصود ہو گا کہ پورے نظامِ اجتماعی پر' ملک پر' پوری قومی زندگی پر اللہ کے دین کو قائم و نافذ کرنا ہے۔ یہ ہے اقامتِ دین جو سورۃ الشوریٰ کا مرکزی مضمون ہے۔

توحید عملی کے موضوع پر سورۃ الزمر' المؤمن' حم السجدۃ اور الشوریٰ کا گروپ بہت اہم ہے۔ سورۃ الزمر میں انفرادی سطح پر توحید عملی کا بیان ہوا۔ اسی کا باطنی پہلو توحید فی الدعاء سورۃ المؤمن میں بیان ہوا۔ پھر انفرادی سطح سے اجتماعی سطح کی طرف بڑھیں تو دعوتِ توحید کا یہ مرحلہ سورۂ حم السجدۃ میں ذکر ہوا ـــــ اور اجتماعی سطح پر توحید عملی کا ہدف ہے اقامتِ دین جو سورۃ الشوریٰ میں بیان ہوا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس فیصلہ کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنی توانائیاں اور اپنی قوتیں اس توحید عملی پر مرتکز کریں اور انفرادی سطح سے اجتماعی نظام تک اس توحید کو برپا کرنے کے لئے اپنی کمر کس لیں۔

توحیدِ عملی
کا فریضۂ اقامتِ دین سے ربط و تعلّق

سورۃ الشوریٰ کی زیر مطالعہ آیات کو اقامتِ دین کے موضوع پر قرآن مجید کے ذروۂ سنام (Climax) کی حیثیت حاصل ہے۔

﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ ﴾ میں لکُمْ خطاب کی ضمیر ہے اور اس کی مخاطب پوری نوعِ انسانی ہے' جو کہ اُمّتِ محمد ﷺ ہے۔ قبل ازیں یہ وضاحت کی جاچکی ہے کہ جو لوگ آپؐ کی تصدیق کرتے ہیں' آپؐ پر ایمان رکھتے ہیں' آپؐ کو اللہ کا آخری نبی و رسول مانتے ہیں' خود کو آپؐ کی ذاتِ اقدس سے منسوب کرتے ہیں وہ اُمّتِ اجابت ہیں اور باقی تمام انسان اُمّتِ دعوت ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لئے ہوئی ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت سے لے کر تا قیامِ قیامت جتنے انسان بھی اس دنیا میں آئیں گے وہ سب آپؐ کی اُمّتِ دعوت میں شامل ہیں۔ "شَرَعَ" کے معنی ہیں "کسی چیز کو مقرر کر دینا۔" ہمارے یہاں عام طور پر استعمال ہوتا ہے یہ "شارعِ عام" نہیں ہے' یا سڑکوں کے نام "شارع" کے ساتھ رکھے جانے لگے ہیں' جیسے "شارع فیصل"۔ چونکہ سڑک اور راستہ چلنے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے اس لئے شارع کہلاتا ہے۔ تو کسی چیز کا تعین اور مقرر ہو جانا لفظ "شَرَعَ" کا اصل مفہوم ہے۔

﴿ شَرَعَ لَكُمْ .... وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ﴾ کا ترجمہ ہو گا:

> "مقرر کیا تمہارے لئے دین میں سے وہی کچھ جس کی وصیت کی تھی (اللہ نے) نوح (علیہ السلام) کو اور جس کی وحی کی ہم نے (اے محمد ﷺ!) آپؐ کی طرف' اور جس کی ہم نے وصیت کی تھی ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو (علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام) کہ دین کو قائم کرو (یا قائم رکھو) اور اس کے بارے میں کسی تفرقہ میں مبتلا نہ ہو جانا"۔

"قائم کرو دین کو" یا "قائم رکھو دین کو" یہ دونوں ترجمے ہوں گے۔ یعنی دین قائم ہو تو اسے قائم رکھو! قائم نہ ہو تو اس کو قائم کرو!!

"اَقِیْمُوْا" کا لفظ اَقَامَ' یُقِیْمُ' اِقَامَۃً (باب افعال) سے فعل امر جمع مذکر مخاطب ہے۔ معنی ہوں گے کسی چیز کو کھڑا کرنا یا کھڑا رکھنا۔ تفہیم کیلئے خیمہ پر قیاس کریں تو اگر خیمہ کھڑا ہے تو کھڑا رکھا جائے گا اور اگر گر گیا ہے تو اسے کھڑا کیا جائے گا ___ کھڑا ہے اور آندھی آ رہی ہے' طوفان آ رہا ہے' تو اسے کھڑا رکھنے کا اہتمام کرنا ہو گا کہ کھونٹے مضبوط ہوں۔ رسّوں کو مضبوطی سے تھام کر رکھنا ہو گا کہ کہیں خیمہ گر نہ جائے۔ پس خیمہ کھڑا ہے تو اسے کھڑا رکھو اور اگر گر گیا ہے تو کھڑا کرو۔ تو یہ دونوں مفہوم اَقِیْمُوْا کے فعل امر میں شامل ہیں۔ مَیں نے یہ دونوں مفہوم اس لئے بیان کئے ہیں کہ تراجم میں اگر یہ لفظی فرق آپ کو نظر آئے تو اس کی وجہ سے پریشان نہ ہو جائیں کہ ترجمہ "کھڑا رکھو" درست ہے یا "کھڑا کرو" ___ دونوں ترجمے درست ہیں۔ دونوں مفاہیم اَقِیْمُوا الدِّیْنَ میں موجود ہیں۔ "دین کو قائم رکھو یا قائم کرو"۔

قابلِ غور مقام

آیت کے اس حصہ کے آخر میں فرمایا : ﴿ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ﴾ "اور اس کے بارے میں کسی تفرقہ میں مبتلا نہ ہو جانا"۔ یہاں "فِیْهِ" کا لفظ بہت اہم ہے' اس کو اچھی طرح سمجھنا ہو گا۔ اس مقصد کے لئے لفظ "دین" کو ایک مرتبہ پھر اچھی طرح جان لیجئے کہ "دین" کس کو کہتے ہیں اور دین میں تفرقہ کے معانی کیا ہوں گے؟ اگرچہ دین اور تفرقہ کی تشریح پہلے ہو چکی ہے تاہم چونکہ اس سورۂ مبارکہ کا یہ عمود اور مرکزی مضمون ہے لہٰذا ایک بار پھر ان کو اچھی طرح سمجھنا اور ذہن نشین کرنا ضروری ہو گا۔

لفظ "دین" کی مزید تشریح

عربی زبان میں دین کا لفظ بنا ہے دَانَ یَدِیْنُ سے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں بدلہ

اور جزا و سزا۔ جیسے سورۃ الفاتحہ میں فرمایا : ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ "بدلے یا جزا کے دن کا مالک"۔ سورۃ الماعون میں فرمایا : ﴿ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ○ ﴾ "کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جو (آخرت کے) بدلہ اور جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے"۔ سورۃ الانفطار میں فرمایا : ﴿ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ○ ﴾ (آیت ۹) "ہرگز نہیں ' بلکہ (تمہارے اعراض کی اصل وجہ یہ ہے کہ) تم بدلہ اور جزا و سزا (کے دن) کو جھٹلاتے ہو"۔ قرآن مجید کی ان تین آیات کے حوالے سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ان میں "دِین" کے معنی بدلہ اور جزا و سزا کے ہیں۔ یہ اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے۔ اسی معنی میں لفظ "دَین" آتا ہے' جس کے معنی قرض کے ہیں۔ آپ کسی کو کوئی چیز ہبہ کر دیں تو وہ واپس نہیں لی جاتی۔ وہ ہدیہ ہے' عطیہ ہے۔ لیکن دَین کیا ہوتا ہے؟ آپ نے کسی کو قرض دیا' اب اسے آپ نے واپس لینا ہے۔ دَین اور دِین میں حروف کا فرق نہیں ہے' دونوں میں د' ی' ن استعمال ہوئے ہیں۔ فرق پہلے حرف پر زبر اور زیر کا ہے' حروفِ اصلی ایک ہی ہیں۔ ہبہ 'ہدیہ 'عطیہ ' آپ اسے جو بھی کہیں' وہ واپس نہیں ملتا' جبکہ اس کے بالمقابل دَین واپس ملتا ہے۔ للذا جزا و سزا عمل کا واپس آنا ہے۔ نیک عمل کا بدلہ جزا کی صورت میں ملے گا۔ یہ اس عمل کا return یعنی اس کا واپس آ جانا ہے۔ بدی کی ہے تو سزا کی شکل میں بدلہ ملے گا۔ یہ بھی اس بُرے عمل کا واپس آ جانا ہے۔ پس دِین کے اندر بھی یہ بنیادی مفہوم موجود ہے۔

لفظ "دِین" کا دوسرا بنیادی مفہوم ہے اطاعت۔ اس کا تعلق بھی بدلہ اور جزا و سزا سے قائم رہتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جزا و سزا کسی قانون کے تحت ہی دی جاتی ہے۔ جنگل کا قانون ہو تو دوسری بات ہے' لیکن مہذب اور متمدن معاشرے میں جزا و سزا کسی قانون کو مستلزم ہے کہ قانون کے مطابق کام ہو رہا ہو تو جزا اور تحسین ملے اور اگر اس کے خلاف کام ہو رہا ہو تو سزا اور نفرین ملے۔ پھر اس کے ساتھ کسی ایسی ہستی کا تصور لازماً ہو گا جو قانون دینے والی ہو' جس کی اطاعت کی جائے تو جزا ملے

اور اس کی نافرمانی کی جائے تو سزا ملے ـــــ لفظ دین کے یہ بنیادی مفاہیم ہیں۔ ایک شاعر کا ایک مصرع ہے : "دِنَّاھُمْ کَمَا دَانُوْا" "جیسا انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا اس کا ہم نے بھرپور بدلہ لے لیا"۔ اسی طرح عربی کا ایک مقولہ ہے : کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ۔ اس کے معنی بالکل وہی ہیں جو اردو کے اس محاورے کے ہیں "جیسا کرو گے ویسا بھرو گے"۔ ہندی میں اسے "کرنی کا پھل" کہا جاتا ہے۔

ان بنیادی مفاہیم کی توضیحات سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ "دین" کے اساسی معنی ہوئے جزا و سزا کی شکل میں کسی قانون اور ضابطہ کے تحت بدلہ' جبکہ کوئی ہستی جو قانون دینے والی ہو اس کی اطاعت ہو تو جزا ملے 'نافرمانی ہو تو سزا ملے۔

قرآنی اصطلاحات

یہ بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ عربی زبان تو نزولِ قرآنِ حکیم سے پہلے موجود تھی۔ اسی عربی مبین میں قرآن نازل ہوا۔ پس عربی ہی کے الفاظ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز کے لئے چن لیا اور معتدبہ الفاظ کے مفاہیم و معانی میں وسعت دے کر اصطلاحات کی شکل عطا فرمادی۔ جیسے لفظ صلٰوۃ پہلے بھی تھا' زکوٰۃ پہلے بھی تھا' صوم پہلے بھی تھا' لیکن جب ان الفاظ نے قرآنی اصطلاحات کی شکل اختیار کی تو اب ان الفاظ کو جب اصطلاحاً بولا جائے گا تو اس کے معنی و مفہوم وہی پیش نظر رہیں گے جو قرآن مجید میں اصطلاحات کی صورت میں ان میں شامل کئے گئے ہیں۔ اسی طرح لفظ "دین" کو قرآن مجید نے اپنی اہم اصطلاح بنایا۔ اس اصطلاح کا مفہوم یہ ہو گا کہ:

> "کسی ہستی کو مطاعِ مطلق مان کر اس کی کامل اطاعت کے اصول پر جو نظامِ زندگی بنے گا وہ اس ہستی کا دین قرار پائے گا"۔

غور فرمایئے کہ جہاں بھی کوئی نظام ہو گا وہاں پہلے یہ طے ہو گا کہ کون ہے مطاعِ مطلق اور مختارِ مطلق؟ کون ہے اصل قانون ساز؟ کون ہے حقیقی مقنن؟ یہ طے ہو جانے کے بعد اس کی اطاعت کے اصول پر پورا نظام بنے گا اور قوانین مدون ہوں گے۔ اس کے جو احکام ہوں گے ان ہی کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کے

معاملات چلائے جائیں گے۔ اس طرح جو نظام بنے گا وہ اس ہستی کا دین ہو گا۔

چنانچہ بادشاہی نظام کیا ہے! بادشاہ حاکم مطلق (Sovereign) ہے۔ حاکمیت اس کی ہے' اس کی زبان سے نکلا ہوا لفظ قانون ہے۔ لہٰذا اس اصول پر جو نظام بنے گا اسے کہیں گے دین الملک' یعنی بادشاہ کا نظام۔ یہ لفظ قرآن مجید میں اس موقع پر سورۂ یوسف میں آیا ہے جب حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بن یامین کو روکنا چاہتے تھے' لیکن وہاں بادشاہی قانون نافذ و رائج تھا جس کے تحت ان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہ تھا ــــــ حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے بادشاہ نہیں تھے' بعض لوگوں کو یہ مغالطہ ہو گیا ہے' بلکہ اس حکومت میں بہت بڑے عہدے پر تھے۔ وزیر خوراک کہہ لیں' وزیر خزانہ کہہ لیں۔ خود حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے کہا تھا : ﴿ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ○ ﴾ (یوسف : ۵۵) "ملک کے خزانے میرے سپرد کر دو' (میں ان کا صحیح انتظام کروں گا) مَیں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں"۔ تو معلوم ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام ایک بہت بڑے عہدے دار تھے' چیف سیکریٹری کہہ لیجئے' لیکن بادشاہ تو نہیں تھے۔ بادشاہِ وقت کے خواب کی تعبیر بتا کر تو آپؑ جیل خانے سے رہا ہوئے تھے۔ چونکہ وہاں شاہی نظام تھا' لہٰذا اس کی رو سے بلا کسی سبب کے کسی غیر ملکی (Foreigner) کو روک لینا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا ایک خاص شکل اللہ تبارک و تعالیٰ نے پیدا فرمائی۔ چنانچہ فرمایا :

﴿ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ ﴾ (یوسف : ۷۶)

"اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر فرمائی (ان کے لئے اپنے بھائی کو روکنے کے لئے ایک سبب پیدا فرما دیا)' اس (یوسف) کے لئے بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی قانون) کے تحت اپنے بھائی کو پکڑنا ممکن نہ تھا' الاّ یہ کہ اللہ ہی نے ایسا چاہا"۔

قرآن کے حوالے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بادشاہی نظام کو بھی قرآن

"دین" کہتا ہے، مگر یہ "دینُ الملک" کہلاتا ہے۔

موجودہ دَور میں دنیا جمہوریت کی دیوانی ہے۔ دیکھئے دین الملک اور دین اللہ تو قرآنی اصطلاحات ہیں، البتہ دین جمہور کی اصطلاح ہمیں قرآن و حدیث میں نہیں ملتی۔ چونکہ اس وقت جمہوریت کا زمانہ نہیں تھا، اس کا تصور موجود نہیں تھا، لہٰذا جو چیز عوام کے ذہن اور ادراک میں تھی ہی نہیں، جس کا چلن تو ایک طرف رہا تصور تک موجود نہیں تھا اس کو قرآن و حدیث میں لا کر لوگوں کے ذہن پر بوجھ نہیں ڈالا گیا، البتہ دو انتہائیں بیان فرما دیں : دین الملک اور دین اللہ۔ اب اس کے درمیان آپ خود خانہ پری کریں۔ "ایں قدر گفتیم باقی فکر کن" کے مصداق آپ کو اوّل و آخر بتا دیا گیا، درمیانی کام آپ خود کیجئے۔ نظامِ جمہوریت کے اصول و مبادی چونکہ وہی ہیں جو دین الملک اور دین اللہ کے ہیں تو ان پر قیاس کرتے ہوئے کہا جائے گا کہ جمہوریت فی الواقع ایک دین ہے۔

ہوا یہ ہے کہ جب مذہب کو انسان کی زندگی کا محض ایک نجی معاملہ (Private Affair) بنا دیا گیا اور ملوکیت کا دَور قریباً ختم ہوا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ نظام کے لئے انسانی ذہن کوئی راہ تلاش کرے اور کوئی اصول وضع کرے۔ لہٰذا طے کیا گیا کہ ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملک میں Sovereign ہیں۔ حاکمیت جمہور کی یعنی عوام کی ہے۔ قانون سازی اور نظام کی ہیئت، اس کے اصول و مبادی طے کرنے کا اختیار بالکلیہ عوام کو حاصل ہے۔ ان کے منتخب کردہ نمائندے پارلیمان یا اسمبلی میں اکثریت رائے سے ہر نوع کا قانون بنانے کے مجاز و مختارِ کل ہیں۔ ان کے لئے کسی آسمانی شریعت و ہدایت اور کسی اخلاقی قدر کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ ان کے نزدیک فیصلہ کن اور حتمی و قطعی بات اپنے عوام کی پسند و ناپسند ہے۔ عوام کا منتخب ایوان مجاز ہے کہ اکیاون فیصد اکثریت سے جو چاہے قانون بنائے۔ وہ چاہے تو ہم جنسی جیسے مکروہ فعل کو بھی جائز قرار دے۔ پارلیمان چاہے تو شارعِ عام پر، پارکوں میں، کلبوں میں، ڈراموں میں، اسٹیج پر جنسی فعل اور اختلاط کو جائز قرار دے

دے' جیسا کہ یورپ کے اکثر ممالک اور امریکہ کی اکثر ریاستوں میں اس فحاشی پر کوئی قدغن نہیں' بلکہ اس شیطانی فعل کو قانونی تحفظ حاصل ہے ـــــ وہ چاہے تو شراب نوشی' قمار بازی' سٹہ' لاٹری اور اسی قبیل کے منکرات کو تفریح یا ضرورت کا نام دے کر قانونی طور پر جائز قرار دے دے' جیسا کہ دُنیا کے اکثر ممالک میں عملاً یہ ہو رہا ہے۔ یہ ہے اصل جمہوریت جس میں جمہور کے نمائندوں کو قانون سازی کے لامحدود اختیارات حاصل ہیں۔ ان پر کوئی تحدید (Limitation) نہیں ہے۔ چونکہ جمہوریت میں اصل حاکمیت (Sovereignity) عوام کی ہے' لہٰذا اسمبلی ان عوام کی نمائندگی کرتی ہے۔

اسلامی جمہوریہ کی بات چھوڑ دیجئے۔ اوّل تو فی الوقت صحیح معنوں میں یہ کہیں قائم ہی نہیں۔ اگر ہو گی تو ظاہر بات ہے کہ اس میں دستور ساز اسمبلی (Legislative Assembly) یا پارلیمنٹ کو اس محدود دائرہ میں قانون سازی کا اختیار حاصل ہو گا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ان کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔ اس میں بھی وہ شریعت کے کسی حکم سے نہ تجاوز کر سکتے ہیں نہ اعراض ـــــ پارلیمنٹ کو لامحدود (unlimited) اختیارات کسی طور پر حاصل نہیں ہوں گے۔

جب اللہ کو مان لیا جائے کہ مطاعِ مطلق وہ ہے' حاکمیتِ مُطلقہ اس کی ہے' بادشاہِ حقیقی صرف وہ ہے تو پھر قانون دینے کا اصل مجاز وہی ہے' شارعِ حقیقی وہی ہے' رسول اس کے نمائندے کی حیثیت سے ہیں' لیکن اصلاً حکومت اللہ کی ہے' مطلقاً اطاعت اس کی ہے' اور یہ اطاعت بواسطہ رسول اللہ ﷺ ہو گی۔ اس بات کو قرآن مجید میں واضح طور پر فرما دیا گیا کہ: ﴿ مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾ "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔ یہاں الرسول سے مراد ہیں جناب محمد ﷺ۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ "اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اذنِ الٰہی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے"۔ اس آیت میں قاعدہ کلیہ کے طور پر یہ بات آ گئی ہے کہ

اللہ کی اطاعت کا واسطہ رسول ہی ہوا کرتے ہیں۔

قرآن حکیم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کا مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے۔ یہاں ان سب کا احصاء ممکن نہیں' للذا چند آیات پیش ہیں۔ سورۂ یوسف میں ایک جگہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا گیا : ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ...﴾ (یوسف : ۴۰) "فرمان روائی اور حکم دینے کا اختیار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی سیدھا طریق زندگی ہے"۔ اسی سورۂ یوسف میں دوسرے مقام پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے ادا کرایا گیا : ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ؀﴾ (یوسف : ۶۷) "حاکمیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کو (کسی پر) بھروسہ کرنا ہے تو اسے چاہئے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کرے"۔ سورۃ الانعام میں ایک دوسرے انداز سے اس بات کا اظہار فرمایا گیا کہ : ﴿ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ؀ ﴾ (الانعام : ۶۲) "آگاہ ہو جاؤ! حقیقی حاکمیت اللہ ہی کی ہے اور وہ حساب لینے میں بڑا تیز ہے"۔ "لَهُ الْحُكْمُ" قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے۔ مزید برآں یہ مضمون مختلف اسالیب سے قرآن مجید میں بار بار آیا ہے کہ ﴿ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ اور ﴿ لَهُ الْمُلْكُ ﴾ ـــــ یہاں دونوں جگہ جو حرفِ جار لام آیا ہے یہ لامِ تملیک بھی ہے اور لامِ استحقاق بھی ـــــ یعنی De-Facto and De-jure اسی کی بادشاہت ہے۔ اور یہ بادشاہت دنیا کے عام بادشاہوں کی طرح نہیں ہے' بلکہ اس شان سے ہے کہ وہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے : ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ ؀﴾ "نہایت بزرگ و برتر و بالا ہے وہ ہستی (اللہ) جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے' اس کے آڑے آنے والا کوئی نہیں ہے۔

اللہ کی حاکمیت مطلقہ پر جو نظام بنے گا وہ دین اللہ ہو گا۔ آخری پارے کی مختصر

سورت سورۃ النصر میں یہ اصطلاح آتی ہے :

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ○ ﴾ (النصر : ۱'۲)

"(اے نبی!) جب اللہ کی مدد آ گئی اور فتح نصیب ہو گئی تو آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں"۔

ان آیات میں فتح مکہ کے بعد کا نقشہ کھینچا گیا ہے جب جزیرہ نمائے عرب کے چہار اطراف سے قبائل مدینۃ النبیؐ میں چلے آ رہے تھے' اللہ کو اپنا مالک و آقا اور جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو بحیثیت رسول اور اللہ کا نمائندہ تسلیم کر رہے تھے' آپ کا ہر حکم ماننے کے لئے آمادہ تھے اور جوق در جوق اسلام (دین اللہ) میں شامل ہو رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو عمل کی جو تھوڑی سی آزادی دی ہے اور اسے یہ اختیار دیا ہے کہ ﴿ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴾ "چاہے شکر گزار بندہ بن کر رہے چاہے ناشکرا" تو اللہ کا مطالبہ یہ ہے کہ اپنی آزاد مرضی سے انسان اللہ کا مطیع' فرماں بردار' اطاعت گزار بن کر رہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر گوشے میں اسی کی ہدایت پر عمل پیرا ہو۔ یہ ہے لفظ "دین" کا حقیقی مفہوم اور "مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ" کا اصل تقاضا۔

ہر دین غلبہ چاہتا ہے

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ "دین" اس نظامِ زندگی کو کہتے ہیں جس میں انفرادی سے لے کر اجتماعی زندگی تک کلی زندگی ایک مطاع کی اطاعت کے تابع ہو تو ایک حقیقت مزید سمجھ لیجئے کہ ہر "دین" اپنی فطرت کے اعتبار سے یہ چاہتا ہے کہ وہ قائم ہو اور غالب ہو۔ بادشاہ کا دین قائم و نافذ ہو تو بادشاہ کا دین کہلائے گا' بادشاہ مغلوب ہو گیا تو پھر بادشاہ کا دین کہاں رہا! وہ تو ختم ہوا۔ جب تک بادشاہت قائم ہے اس وقت تک دین الملک ہے' ورنہ نہیں ـــــ سورۃ الزخرف میں دیکھئے جہاں فرعون کا قول نقل ہوا ہے' اس نے اپنی قوم کو منادی کرائی : ﴿ وَنَادٰى فِرْعَوْنُ

فِیْ قَوْمِهٖ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ﴾ (الزخرف : ۵۱) "اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی اور کہا" اے میری قوم کے لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ سارا آب پاشی کا نظام میرے اختیار میں نہیں ہے؟" یعنی میں جس کو چاہوں پانی دوں اور جس کے لئے چاہوں پانی روک لوں۔ پھر سورۃ البقرۃ میں اس مُحاجّہ کو دیکھئے جو نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا تھا : ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ﴾ "(اے نبی!) کیا آپ نے اس شخص (نمرود) کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم (علیہ السلام) سے جھگڑا کیا تھا ان کے رب کے بارے میں' اس بناء پر کہ اللہ نے اسے حکومت دے رکھی تھی"۔ اس حکومت کی بنیاد پر اس کو زعم ہو گیا تھا کہ مختارِ مطلق اور علی الاطلاق حاکم وبادشاہ وہ ہے۔ وہ بھی خدائی کا مدعی تھا۔ ﴿ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ﴾ "جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اس سے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے" تو وہ سرکش بولا : "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے"۔ روایات میں آتا ہے کہ اس نے دو قیدی جیل سے بلوائے' ان میں سے ایک کو آزاد کیا کہ جاؤ تم بری ہو اور دوسرے کی دربار ہی میں گردن اڑا دی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا دیکھو میں نے ایک کو زندہ رکھا اور ایک کو مروا دیا' تو میرے پاس زندگی اور موت کا اختیار ہوا کہ نہیں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یہ تو کج بحثی پر اتر آیا ہے تو انہوں نے آخری بات کہہ دی کہ ﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ﴾ "میرا رب تو وہ ہے جو سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے' تُو ذرا اسے مغرب سے نکال لا" اگر تجھے واقعی اختیار حاصل ہے تو یہ کر کے دکھا۔ اس بات پر وہ کافر مبہوت' حیران اور ششدر ہو کر رہ گیا۔ ﴿ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ﴾ وہ لاجواب ہو گیا' بغلیں جھانکنے لگا۔ جس طرح نمرود نے کہا تھا کہ زندگی اور موت میرے قبضہ میں ہے' اسی طرح فرعون نے کہا تھا کہ آب پاشی کا نظام اور حکومت کا انصرام میرے ہاتھ میں

ہے۔ ﴿ اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ ﴾ ـــــ لٰہذا میرا حکم چلے گا۔ تو جب تک اس کا حکم چل رہا ہے تو یہ اس کا دین ہے' یہ نہیں تو دین کہاں رہا! ختم ہو گیا۔ اسی طرح جب جمہور کو انتخاب کا حق حاصل ہے اور وہ اپنے نمائندوں پر مشتمل پارلیمان یا اسمبلی منتخب کرتے ہیں اور یہ منتخب پارلیمان جمہور کی حاکمیت کے اصول پر کاروبارِ حکومت چلاتی ہے تو جمہوریت بالفعل قائم ہے' لیکن اگر کوئی فوجی سربراہ اپنے ساتھیوں کے تعاون سے اسمبلی یا پارلیمنٹ کو توڑ دے اور مارشل لاء نافذ کر کے بحیثیت چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر حکومت کا انتظام و انصرام اور جملہ اختیارات سنبھال لے تو جمہوریت کہاں رہی! دین جمہور ختم ہو گیا' اس لئے کہ نظام تو وہی ہے جو بالفعل قائم ہو اور واقعتاً اس کے اختیارات کا سکّہ چل رہا ہو۔ بالکل اسی طرح دین اللہ قائم و نافذ اسی وقت سمجھا جائے گا جب امرِ واقعہ میں وہ نظام قائم ہو جس میں بالفعل اللہ ہی کو حاکمِ مطلق مانا گیا ہو اور مطاعِ مطلق فی الحقیقت اللہ ہی کو تسلیم کیا گیا ہو' اسی کے احکام کے آگے سب کے سر جھکے ہوئے ہوں اور عملاً صورتِ حال یہ ہو کہ ﴿ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الْعُلْيَا ﴾ کہ اللہ کا کلمہ سب سے اونچا ہو جائے' اللہ کی بات' اس کا فرمان بالاترین ہو جائے اور یہ ہو پورے نظامِ زندگی پر ـــــ جزوی نہیں' کل کا کل نظام اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت میں جکڑا ہوا ہو۔

کامل غلبہ درکار ہے

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انفرادی توحید جزوی مطلوب نہیں ہوتی' بلکہ کُلّی مطلوب ہوتی ہے۔ ﴿ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ○ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ﴾ "پس بندگی کرو اللہ کی' اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ اور آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے لئے تو دین خالص مطلوب ہے"۔ اسی طرح اجتماعی توحید بھی کُلّی مطلوب ہے۔ اللہ اس بات کے لئے تیار نہیں ہے کہ آدھا دین میرا مان لو' کچھ اطاعت میری کر لو اور آدھا دین کسی اور کا مان لو' اس کی اطاعت بھی کر لو۔ یہ طرزِ عمل درکار

نہیں ہے۔ اللہ کا مطالبہ تو یہ ہے کہ کل کا کل دین' کامل اطاعت اسی کے لئے خالص ہو جائے اور دین میں انسان پورا کا پورا داخل ہو جائے۔ ﴿ اُدۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً ﴾ "فرماں برداری میں (دین میں) پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔" چنانچہ سورۃ الانفال میں جو بتایا گیا ہے کہ قتال کی آخری منزل کیا ہے؟ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا آخری ہدف کیا ہے! فرمایا : ﴿ وَقَاتِلُوۡهُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ وَّیَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ ﴾ (الانفال : ۳۹) "(اے مسلمانو!) ان (کافروں اور مشرکوں) سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ و فساد بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لئے ہو جائے"۔ یہ نہیں کہ اس کا کوئی جزو مان لیا جائے۔ مسجد میں تو اللہ کی مرضی چل رہی ہو' پارلیمنٹ میں نہ چلتی ہو' سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس اور ماتحت عدالتوں میں نہ چلتی ہو' ذرائع ابلاغ میں نہ چلتی ہو' بازار میں نہ چلتی ہو' منڈی میں نہ چلتی ہو' گھر میں نہ چلتی ہو۔ یہ تو معاذ اللہ تم نے اللہ کو ٹرخا دیا ہے۔ ایک بڑا ہی جزوی اور چھوٹا سا حصہ تو اس کو دیا ہے' باقی سب دوسروں کو الاٹ کر دیا۔

تفریق دین کی ممانعت

اس آیۂ مبارکہ میں وارد الفاظ ﴿ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ ﴾ پر بھی گہرائی میں اتر کر غور کرنا ہو گا۔ خاص طور پر یہاں فِیۡہِ قابل توجہ ہے۔ فَرَّقَ' یُفَرِّقُ' تَفۡرِیۡقًا کے معنی ہیں : ٹکڑے ٹکڑے کر دینا' علیحدہ علیحدہ کر دینا' پھاڑ دینا۔ دین ایک وحدت ہے۔ پورا نظامِ زندگی' انفرادی بھی اور اجتماعی بھی' ایک وحدت بن کر اللہ کے تابع آ جائے تو یہ ہے دین اللہ۔ گویا کہ مکمل دین قائم ہو گیا۔ اگر یہ نہیں ہے' اور حال یہ ہے کہ ﴿ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ ﴾ ــــــ دین کو پھاڑ دیا' کچھ حصہ میں نے لے لیا' کچھ آپ نے لے لیا' کچھ کسی اور کو دے دیا ــــــ دین کے ٹکڑے کر دیئے کہ کچھ حصے کو ہم مانیں گے کچھ کو نہیں مانیں گے تو یہ ہے تفریق دین ــــــ ﴿ اَلَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَکَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ﴾ "(اے محمد ﷺ!) جو لوگ اپنے (اس) دین

کے ٹکڑے کردیں' (اس کو پھاڑ دیں' اس کے حصّے بخرے کردیں) اور خود تفرقے میں بٹ جائیں تو ایسے لوگوں سے آپ کا کوئی تعلق نہیں' (ان سے آپ کو کوئی سروکار نہیں)"۔ لرز جانا اور ڈرنا چاہئے اس وعید سے کہ کس طور پر اللہ عزّوجلّ ایسے لوگوں سے اعلانِ براءت فرمارہے ہیں جو اللہ کے اس دین میں' جو تمام انبیاء و رُسل کا دین ہے' تفرقہ ڈالنے کی روش اختیار کریں کہ ان سے ہمارے نبی ﷺ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ فِیْهِ میں یہ مفہوم غالب ہے۔

اس کا ایک مفہوم اور بھی ہے' وہ یہ کہ اقامتِ دین کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے امت کو بنیانِ مرصوص بن جانا لازم ہے۔ فقہی مسائل میں رائے اور تعبیر کا اختلاف دوسری چیز ہے۔ یہ اختلاف صرف فقہ کے چار مشہور و معروف ائمہ کرام امام ابوحنیفہ' امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ یا اہل سنّت کے علماء کرام کے درمیان نہیں ہوا' بلکہ صحابۂ عظام رضی اللہ عنہم کے مابین بھی رہا ہے۔ یہ فقہی مسالک کے اختلافات اگر اقامتِ دین کے فریضہ کی ادائیگی میں روک بن جائیں' گروہ بندی ہونے لگے' مَن دیگرم تو دیگری والا معاملہ ہو جائے تو یہ وحدتِ ملّی ہی کے لئے مہلک نہیں بلکہ اقامتِ دین کے فریضہ کی انجام دہی میں بھی رکاوٹ بن جائے گا۔ ﴿وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ﴾ میں اس نوع کے تفرقے سے بچنے کا بھی نہی کے اسلوب میں حکم دیا گیا ہے۔ فریضۂ اقامت دین کی ادائیگی کے لئے پوری اُمّت کی اجتماعی قوّت درکار ہے ـــــ دین دُنیا کے صرف ایک حصّہ پر قائم کرنا تو مطلوب نہیں' بلکہ پورے کرۂ ارض پر اللہ کا دین قائم کرنے کی جدوجہد کرنی ہے' پوری دنیا کو نورِ توحید سے منور کرنا ہے۔ گروہ بندی اور تفرقہ بازی کیوں ہوتی ہے! اس کی وجہ کیا ہے! اس کی تصریح و توضیح آگے آئے گی۔

فقہی اختلافات حدود کے اندر رہوں تو تفرقہ نہیں

دین ایک ہو' اور وہ ہو دینِ توحید' اس کے تحت تفصیلی قوانین میں تھوڑا

تھوڑا فرق ہو' تعبیر(interpretation) کا فرق ہو' استنباط کا فرق ہو' اجتہاد کا فرق ہو' لیکن توحید کا اصول سب کے نزدیک ایک ہی ہو تو یہ تفرقہ نہیں۔ ہمارے تمام فقہاء اور سلفی المسلک ائمہ کے نزدیک اصول ایک ہی ہے کہ حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے اور اس کے نمائندے کی حیثیت اس کے رسول کی ہے۔ اللہ اور رسول' یہ ہیں اصل ستون جن پر دین قائم ہے ﴿ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝ ﴾ (التغابن : ۱۲) اس اصول کے تحت مختلف نئے مسائل میں استنباط کیا جا سکتا ہے۔ ہر مجتہد اور ہر فقیہہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے منشاء کے مطابق کسی نئے مسئلہ میں حکم تلاش کر سکتا ہے اور اس میں کچھ نہ کچھ فرق بھی واقع ہو سکتا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ بھٹو صاحب کے خلاف قتل کا مقدمہ جب سپریم کورٹ میں آیا (یہ الگ بات ہے کہ یہ مقدمہ تو پاکستان کی تاریخ کا ایک حصّہ بنے گا) تو اس کے باوجود کہ قانون ایک ہی ہے' نئی شہادتیں سپریم کورٹ میں پیش نہیں ہوئیں' وہ تو ہائی کورٹ میں مقدّمہ کی جو مثل تیار ہوئی تھی اور اس پر جو فیصلہ ہوا تھا اسی پر بحث و تمحیص اور جرح و تعدیل ہوئی اور اس نوع کے مقدمات کے سابقہ فیصلوں اور نظائر سے استدلال و استشہاد ہوا۔ پھر مختلف شہادتوں کے مابین تضادات کی نشاندہی کرنے کی کوشش ہوئی۔ چنانچہ مثل پر جو مختلف شہادتیں ریکارڈ ہوئی تھیں ان میں سے ہر شہادت میں تضاد تلاش کیا گیا۔ سابقہ فیصلے کے سقم بیان کئے گئے' ان تمام امور پر فریقین کے وکلاء نے بحث کی اور اپنے اپنے دلائل دیئے ـــــ اب دیکھئے قانون ایک' ساری مثل ایک' لیکن سپریم کورٹ کے جج صاحبان نے فیصلہ دینے میں اختلاف کیا۔ جنہوں نے پھانسی کی سزا کا حکم دیا اور جنہوں نے بری کرنے کا فیصلہ دیا ان میں سے کسی نے اصول سے اختلاف نہیں کیا۔ وہ سب قانون کو بھی تسلیم کر رہے ہیں' لیکن شہادتوں سے استنباط و استدلال میں اختلاف کر رہے ہیں ـــــ پوری دنیا کو معلوم ہے' کوئی یہ نہیں کہتا کہ فیصلہ کرنے والوں نے بدنیتی سے مختلف فیصلے دیئے

ہیں۔ اور تو اور صرف دو جج ایک قانون کے تحت ایک ہی مقدمہ کو سنتے ہیں تو ان کی آراء میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے۔

پس اختلاف شے دگر ہے۔ لیکن جہاں اصول بدل جائیں گے وہ تفرقہ فی الدّین ہو جائے گا۔ البتہ جب اصول یہ ہو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے تمام واضح احکام یعنی نصوصِ قرآن و سُنّت کی اطاعت اور فرماں داری کی جائے گی اور صرف اسی دائرے میں رہ کر جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کر دیا ہے' معاملات طے کئے جائیں گے تو یہ تفرقہ نہیں ہو گا۔

دین ہمیشہ سے ایک رہا ہے

دین ہمیشہ سے ایک ہی ہے' اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ دین جو حضرت آدم علیہ السلام کا تھا وہی دین محمد ﷺ کا ہے۔ یہ دین ہے دین توحید' یعنی اللہ کو ایک مان لینا' اسے وحدہٗ لاشریک لہٗ جان لینا۔ جب اس توحید کو آپ عملاً انفرادی زندگی میں لے آئیں گے تو وہ ہو گی اللہ کی عبادت' اپنی کُلی اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے ـــــ اور اسی توحید کو جب آپ اجتماعی نظام کے ذیل میں لائیں گے تو یہ ہو گا پورے نظامِ زندگی کو اللہ کے حکم کے تابع کر دینا' یعنی دین اللہ کو بالفعل قائم کر دینا۔ اور یہی اقامتِ دین ہے' بالفاظ مبارکہ : "اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ"۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے ہاں جو فقہی اختلاف پائے جاتے ہیں ان سب میں اصل الاصول توحید ہی ہے۔ مسلّماتِ دین سب کے نزدیک مشترک ہیں۔ سب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اطاعتِ مطلقہ کی سزاوار صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے اور یہ اطاعت بواسطہ رسولؐ ہو گی۔ جناب محمد ﷺ بحیثیتِ رسول اللہ مطاع ہیں۔ آپؐ کے احکام' آپؐ کے فیصلے' آپؐ کی سنّت' آپؐ کے فرمودات واجب اطاعت اور واجبِ اتباع ہیں۔ ازروئے آیاتِ قرآنیہ : ﴿ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ﴾ (النساء : ۸۰)

"جس نے رسول اللہ کی اطاعت کی پس اس نے اللہ کی اطاعت کی"۔ اور

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ○ ﴾ (الاحزاب:۳۶)

"کسی مؤمن مرد اور کسی مؤمن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو پھر اسے اپنے معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا"۔

سورۃ النساء میں فرمایا:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ... ﴾

(النساء : ۶۵)

"(اے محمدؐ!) آپؐ کے رب کی قسم! یہ کبھی مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپؐ ہی کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں . . . ."

علاوہ ازیں ﴿ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ کا حکم قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اللہ کی اطاعت اور اس کے رسولؐ کی اطاعت دین کے دو ستون ہیں جن پر دینِ توحید قائم ہے۔ لہٰذا تمام فقہاء اور ائمہ دین رحمہم اللہ کا دین یہی دینِ توحید ہے۔ وہ چاہے امام ابو حنیفہؒ ہوں، امام مالکؒ ہوں، امام شافعیؒ ہوں، امام احمد بن حنبلؒ ہوں، امام بخاریؒ ہوں وغیرہم۔ کتاب و سنّت سے استدلال کرتے ہوئے جو تفاصیل طے کی جائیں گی تو بعض مسائل کے استنباط، تعبیر اور بعض میں اجتہاد و قیاس، راجح و مرجوح، افضل و مفضول کی آراء میں اختلاف ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔ ان ائمہ عظام کے مابین معاذ اللہ دین کے معاملہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ فقہی مذاہب اور مسالک ہیں۔ سب کا دین، دین اسلام ہے۔ مسلکوں کے اختلافات میں کوئی حرج نہیں، سب حق ہیں۔ لیکن دین میں تفرقہ درست نہیں ہے، یہ تو کفر ہو جائے گا۔

اس بات کو اس طرح بھی سمجھ لیجئے اور فرض کیجئے کہ کسی ملک میں غالب اکثریت امام مالکؒ کے مسلک پر چلنے والوں کی ہے' تو جب وہ اپنے ملک میں اللہ کا دین قائم کریں گے تو وہاں مالکی فقہ رائج ہو جائے گی۔ کسی جگہ پر احناف کی عظیم اکثریت ہے تو وہ جب اپنے یہاں اللہ کا دین قائم کریں گے تو وہاں فقہ حنفی نافذ ہو گی۔ وَقِس عَلٰی ذٰلِکَ۔ لیکن فقہ کے اختلافات کے علی الرغم سب کا دین ایک ہی ہو گا اور وہ ہو گا دین اسلام' دین توحید ــــــ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ دین اور شریعت یا دین اور فقہ میں کیا فرق ہے؟ یہاں بات دین کی ہو رہی ہے' شریعت کی نہیں۔ دین کے معاملہ میں متفرق نہ ہو۔ اس پر جمے رہو' اللہ ہی کو مطاعِ مطلق ماننا ہے' اسی کی حاکیت تسلیم کرنی ہے' اسی کی فرمانبرداری کرنی ہے۔ اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے' اس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت پر مبنی اپنا نظامِ حیات بنانا ہے۔ یہ ہے اقامتِ دین' اس کے بارے میں تفریق میں نہ پڑ جانا۔

اقامتِ دین: مشرکین کے لئے پیغامِ موت

نزولِ قرآن کا پس منظر اور تاویلِ خاص

اوّلاً قرآن مجید ایک خاص دَور میں (۶۱۰ عیسوی سے لے کر ۶۳۲ عیسوی تک) جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ دوسرے یہ کہ ایک خاص ملک یعنی عرب میں پورا کا پورا قرآن نازل ہوا۔ تیسرے یہ کہ قرآن مجید کے اوّلین مخاطب محمدؐ رسول اللہ ﷺ ' پھر آنحضورؐ کے توسط سے اوّلین مخاطب وہی لوگ تھے جو عرب میں آباد تھے۔ لہٰذا قرآن حکیم کی ایک تفسیر اس انداز میں کریں گے کہ جب فلاں آیت یا فلاں سورت نازل ہوئی تو اس خاص پس منظر (Immediate Spectacle) میں اس کا کیا مفہوم سمجھا گیا؟ ہمیں اس آیت یا آیات یا سورت کو اس خاص پس منظر میں رکھ کر غور کرنا ہوگا کہ یہ کب نازل ہوئی! کس مرحلہ پر نازل ہوئی! اس وقت اس کا مفہوم کیا سامنے آیا! اس پر کیا عمل ہوا! یہ ہوگی تاویلِ خاص۔

تاویلِ عام

لیکن قرآن حکیم صرف اس دَور کے لئے نازل نہیں ہوا' بلکہ ابد الآباد تک کے لئے ہدایت و رہنمائی ہے۔ صرف عربوں کے لئے نہیں پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ هُدًى لِّلنَّاسِ ہے۔ لہٰذا دوسری تاویل ہوگی تاویل عام ــــ جس کے لئے مفسرین کا اصول یہ ہے کہ الاعتبار لعموم اللّفظ لا لخصوص السّبب۔ خاص حالات جن میں آیتیں یا سورتیں نازل ہوئیں' ان کو سامنے رکھ کر نہیں' بلکہ الفاظ کو دیکھ کر ان کے عموم سے جو مطلب اخذ کیا جائے گا وہ قرآن مجید کا ابدی مفہوم و مطلب ہوگا۔ لیکن اس تاویل عام کے لئے ضروری ہے کہ انسان تاویل خاص کو سمجھ لے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عام تاویل میں قرآن کے منشاء سے بہت دور چلا جائے۔

اس کا امکان ہے اور غالب امکان ہے۔ لہٰذا پہلے تاویل خاص کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ پھر یہ کہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اس سے جو عام اصول نکل رہے ہوں یا استنباط کئے جاسکتے ہیں تو ان کو پلے باندھ لینا چاہئے کہ یہ ہے قرآن مجید کی ابدی رہنمائی ـــــ یہ ربط و تعلق ہے تاویل خاص اور تاویل عام کا۔

اب تاویل خاص کے اعتبار سے اس پس منظر کو دیکھئے کہ جب یہ آیت نازل ہو رہی ہے کہ اے محمد ﷺ کے مخاطبو! جن تک حضور ﷺ دعوت توحید پہنچا رہے ہیں' یا اے محمد ﷺ کے نام لیواؤ! جنہوں نے اس دعوتِ توحید پر لبیک کہا ہے' اسے قبول کرلیا ہے' تمہارے لئے ہم نے وہی دین مقرر کیا ہے جو حضرت نوح کو دیا' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ کو دیا (علیہم الصلوٰۃ والسلام) اور جو اب ہم نے وحی کیا ہے محمد (ﷺ) کی جانب۔ اور تمہارا فرض کیا ہے؟ ﴿ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ﴾ "یہ کہ اس دین کو قائم کرو اور اس کے بارے میں تفرقہ میں نہ پڑو" ـــــ اب سمجھئے کہ کون کون لوگ اس وقت عرب میں تھے جو نبی اکرم ﷺ کے مخاطبین تھے۔

اوّلین مخاطب مشرکینِ عرب

سب سے پہلے مخاطب تو مشرکین عرب تھے جو ہدایت ربانی سے بہت دُور جاچکے تھے۔ ان کے پاس کوئی آسمانی ہدایت یا کوئی آسمانی کتاب موجود نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر و بیشتر عرب حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ یہ عرب مستعربہ کہلاتے ہیں۔ ان میں کچھ عرب عاربہ ہیں' یعنی اصل عرب کے پرانے رہنے والے۔ اس لئے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تو اصل عرب کے رہنے والے نہیں تھے۔ وہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے ہیں جن کا اصل وطن تو عراق تھا' جنہوں نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو عرب میں آباد کیا تھا۔ بمصداقِ آیت قرآنی : ﴿ رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا

الصَّلٰوۃَ...... ﴾ (ابراہیم : ۳۷) لہٰذا خود حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت عرب مستعربہ کہلاتی ہے۔ یعنی عرب بن گئے ہیں' اصل عرب نہیں ہیں۔ یمن وغیرہ سے جو قبائل نکلے وہ اصل عرب ہیں۔ مدینہ میں اوس و خزرج کے دونوں قبیلے اصلاً یمنی تھے جو وہاں آ کر آباد ہوئے۔ ان کا تعلق عرب عاربہ سے تھا۔ ایک تو یہ قبائل ہیں۔ لیکن ان پر اور عرب کے تمام قدیم قبائل پر حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا اتنا اثر ہوا کہ ان سب لوگوں نے اپنے آپ کو دین ابراہیمی پر ہی قرار دے دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک لقب حنیف بھی تھا۔ قرآن میں بھی آنجناب ؑ کے ساتھ یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا تمام عرب خود کو ملّتِ حنیفی پر عمل پیرا قرار دیتے تھے اور بنی اسمٰعیل کہلاتے تھے۔ پھر یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس نسل میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بعد نبی کوئی نہیں آیا' قریباً ڈھائی ہزار برس کے دوران کوئی نبی نہیں' کوئی رسول نہیں' کوئی کتاب نہیں۔ جبکہ آپ ؑ کی دوسری نسل میں نبی آئے' رسول آئے' کتابیں نازل ہوئیں' ہدایت الٰہی کا سلسلہ جاری رہا' جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام سے چلی اور جو فلسطین کے علاقے میں آباد ہوئی۔ حضرت اسحٰق نبی ہیں' ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت یعقوب نبی ہیں' ان کے بارہ بیٹوں میں سے حضرت یوسف نبی ہیں' علیہم السلام۔ چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا لہٰذا اب یہ بنی اسرائیل کہلائے۔ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ اسی نسل میں چلتا رہا۔ ان ہی میں حضرت موسیٰ ہیں' حضرت داؤد ہیں' حضرت سلیمان ہیں' علیہم السلام۔ ان ہی میں سے حضرت عزیر ہیں' حضرت زکریا ہیں' حضرت یحییٰ ہیں اور بے شمار نبیوں کا سلسلہ ہے جن کا ذکر تورات میں ہے۔ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام ____ اور اس سلسلہ کے آخری نبی و رسول ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کو روح اللہ بھی کہا جاتا ہے۔

بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موقع پر عرب میں عربوں کے یہ دو گروہ عرب مستعربہ اور عرب عاربہ موجود تھے جو اپنے آپ کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی

طرف منسوب کرتے تھے۔ وہ دین اور توحید سے بہت دُور جا چکے تھے۔ کہنے کو وہ کہتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار ہیں' لیکن بدترین شرک میں مبتلا تھے۔ بت پرستی اور ستارہ پرستی ان کے یہاں ہو رہی تھی' فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا ہوا تھا' توحید کی کوئی رمق ان میں باقی نہیں تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حج کے جو مناسک ان کے یہاں چھوڑ گئے تھے ان میں بھی ردوبدل کر لیا تھا۔ مادرزاد برہنہ ہو کر طواف کرنے کو بڑی نیکی کا کام سمجھ رہے تھے۔ نہ معلوم ان کے یہاں اور کیا کیا خرافات آ گئی تھیں! عربوں کے یہ دو گروہ ہیں جن کو قرآن مجید کہتا ہے اُمِّيِّين اور مشرکین۔

دوسرے مخاطبین : اہلِ کتاب

دوسرا گروہ جو قرآن حکیم کا مخاطب تھا وہ نسل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام سے چلی تھی جن کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے۔ یہ بھی آگے چل کر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک وہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے نبیوں کو تو مانتے تھے' لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرتے تھے۔ یہ یہود کہلائے۔ دوسرے وہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان رکھتے تھے کہ آنجناب اللہ کے نبی و رسول تھے' البتہ ان کی اکثریت نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بھی قرار دے رکھا تھا' وہ نصاریٰ (عیسائی) کہلائے ـــــ یہ دونوں گروہ بھی عرب میں آباد تھے۔ یہود کے مدینہ میں تین قبیلے تھے۔ خیبر میں ان یہود کا بہت بڑا گڑھ تھا' جبکہ نجران میں نصاریٰ آباد تھے۔

لہٰذا بعثت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وقت عرب میں دو جماعتیں تھیں۔ ایک تو وہ جو دین سے بہت بعید تھی' جاہل تھی' ان کے پاس نہ شریعت تھی' نہ کوئی آسمانی کتاب' اور یہ بدترین شرک میں مبتلا تھی۔ دوسری جماعت وہ تھی جن کے پاس آسمانی کتاب بھی تھی اگرچہ وہ کافی حد تک محرف ہو چکی تھی اور شریعت بھی تھی۔ ان کے یہاں علماء تھے' فضلاء تھے' مفتی تھے' قاضی تھے۔ ان کا سارے کا سارا

نظام برقرار تھا۔ اسی طرح نصاریٰ تورات کو بھی مانتے تھے اور ان کے پاس انجیل بھی تھی 'گو اس میں بھی کافی تحریف ہو چکی تھی۔ ان کے یہاں بھی بڑے بڑے علماء تھے 'احبار بھی تھے اور رہبان بھی۔ ان دونوں طبقوں کو ذہن میں رکھیئے۔ اب اس پس منظر میں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے اسے سمجھئے!

دعوتِ محمدیؐ کی مخالفت

نبی اکرم ﷺ نے جب دعوت شروع کی اور آپ نے دیکھا کہ لوگ اس مطابق فطرت دعوت کو قبول نہیں کر رہے 'ایمان نہیں لا رہے 'مخالفت ہو رہی ہے 'کشمکش ہو رہی ہے 'مُٹھی بھر جو سعید روحیں ایمان لے آئی ہیں ان پر تشدد ہو رہا ہے 'ان کو شدید ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے 'حالانکہ اسی مکہ کے رہنے والے اجرائے وحی اور آغازِ دعوتِ توحید سے قبل آنحضور ﷺ سے انتہائی محبت کرتے تھے اور آپ کو الصادق اور الامین کے القابات سے پکارتے تھے 'وہ تو آپ کے قدموں تلے اپنی آنکھیں بچھاتے تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب آنحضور ﷺ نے دعوتِ توحید شروع کی تو وہی مکہ والے جو جان چھڑکتے تھے 'اب وہی خون کے پیاسے ہو گئے۔

بنوہاشم کی حمایت

ابو طالب کو نبی اکرم ﷺ سے نہایت محبت تھی 'طبعی اور قلبی محبت۔ وہ اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے لیکن اس محبت کی وجہ سے آنحضور ﷺ کو ان کی حمایت حاصل تھی۔ ابو طالب چونکہ بنوہاشم کے قبیلہ کے سردار تھے لہٰذا قبائلی دستور کے مطابق پورا قبیلہ سردار کے ساتھ تھا۔ چنانچہ بنوہاشم کی حمایت حضور ﷺ کو حاصل تھی جو قریش کا سب سے بااثر قبیلہ تھا۔ اس لئے قریش کو نبی اکرم ﷺ کے خلاف کوئی براہِ راست اقدام کی جرأت نہیں ہوئی۔ قریش جانتے تھے کہ اگر ہم نے محمد (ﷺ) کو نقصان پہنچایا تو اس نظام کے تحت بنوہاشم کا پورا قبیلہ خون کا بدلہ لینے کے لئے اٹھ

کھڑا ہو گا' چاہے وہ قبیلہ ایمان نہ لایا ہو گا۔ اس طرح ایک خون ریز خانہ جنگی شروع ہو جائے گی جس کا وہ تحمل نہیں کر سکتے۔ پورے عرب میں ان کا رعب اور دبدبہ قریش کے تمام قبیلوں کے متحد ہونے کے سبب سے تھا۔ آپس کی جنگ ان کے لئے بڑی نازک صورت حال پیدا کر دیتی۔ قریش کو اندیشہ تھا کہ اگر ہمارے مابین تفرقہ ہو گیا تو ہماری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اس لئے وہ آنحضور ﷺ کے خون کے پیاسے ہونے کے باوجود آپؐ کی جان لینے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے' لیکن مخالفت شدید تھی اور طرح طرح سے نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کو تکلیفیں پہنچانے کا سلسلہ جاری تھا۔

اہلِ کتاب کا مخالفانہ رویّہ

دوسری طرف دعوتِ توحید قبول کرنے کی توقع اہلِ کتاب سے ہو سکتی تھی کہ چلو قریش تو جاہل ہیں' ان کے پاس کتاب نہیں' شریعت نہیں' وحی کا نور نہیں' لیکن اہلِ کتاب تو وہ لوگ ہیں جن کے پاس کتاب بھی ہے' شریعت بھی ہے' دین کا علم بھی ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو نبی آخر الزمان ﷺ کے منتظر تھے' ان کی بعثت کے لئے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ اللہ! تیرے آخری نبی کے ظہور کا وقت کب آئے گا۔ یہودی جب اصل عربوں سے لڑائی ہوتی تھی تو وہ مار کھاتے تھے' پٹتے تھے۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ سرمایہ دار تو مار کھاتا ہے' جس طرح ہندوستان میں مسلمان چاہے تھوڑے ہوتے تھے' اقلیت میں ہوتے تھے' لیکن جب فساد ہوتا تھا تو بنیا مار کھاتا تھا۔ یہی معاملہ یہودیوں کا ہوتا تھا' وہ طبعی طور پر بزدل تھے لہٰذا وہ مار کھاتے تھے۔ لیکن جب وہ پٹتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ ٹھیک ہے' اس وقت تو ہم تم سے پٹ گئے ہیں' لیکن آخری نبی کے ظہور کا وقت قریب ہے' جب ہم ان کی زیر قیادت تم سے جنگ کریں گے تو تم ہم پر غالب نہیں آسکو گے ـــــ یثرب میں رہنے والے اوس و خزرج کے عرب قبائل کو بھی یہودی یہی دھمکیاں دیا کرتے تھے۔

یہود کی یہی دھمکیاں (جس کو Irony of Fate کہیں گے) مدینہ والوں کے ایمان لانے میں سبقت کا ذریعہ بن گئیں۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ ہمارے یہاں یہود کے بڑے بڑے علماء ہیں' وہ یہ کہا کرتے ہیں کہ آخری نبی کے ظہور کا وقت ہے۔ لہٰذا جیسے ہی رات کی تاریکی میں مکّہ کی وادی عقبہ میں مدینے سے آئے ہوئے چھ اشخاص کی نبی اکرم ﷺ سے ملاقات ہوئی جہاں آپؐ تبلیغ کے لئے گشت فرما رہے تھے' تو آپؐ نے ان کے سامنے توحید پیش فرمائی' ان لوگوں نے ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا کہ ہو نہ ہو یہ وہی نبی ہیں جن کی بعثت کا یہود ذکر کیا کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے طے کیا کہ ہم سبقت کر کے آپؐ کے ہاتھ پر ایمان لے آئیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ یہودی سبقت کر جائیں۔ یہود کی دی ہوئی خبروں کے ذریعہ سے ان چھ حضرات کو تو ہدایت حاصل ہو گئی اور یہ ایمان لے آئے۔ لیکن یہود کے علماء کا حال وہ رہا جس کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے : ﴿یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ یہ اگرچہ محمد (ﷺ) کو اور قرآن مجید کو اچھی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں' لیکن اس کے باوجود آنحضور ﷺ کی دشمنی میں یہود سب سے آگے بڑھ گئے ____ وجہ یہ تھی کہ ان کا خیال تھا کہ نبی آخر الزمان بنی اسرائیل میں سے مبعوث ہوں گے۔ اس لئے کہ ڈھائی ہزار برس سے نبوت ہمارے ہاں چلی آرہی ہے' یہ تار کبھی ٹوٹا ہی نہیں۔ لیکن ان کی توقع کے خلاف خاتم النبیّین والمرسلین کا ظہور بنی اسمٰعیل میں ہو گیا۔ یہ بات ان کے لئے بہت بڑی آزمائش بن گئی کہ ہم بنی اسمٰعیل کے ایک فرد کے آگے کیسے جھک جائیں! وہ تو امی قوم ہے' اَن پڑھ قوم ہے' ان میں دین نہیں' ان کے پاس کوئی علم نہیں' کہیں سے فارغ التحصیل نہیں' ان کے پاس کسی دار العلوم کی سند نہیں' ان کے پاس کسی صاحب علم کی جانب سے کوئی Testimonial نہیں' ہم ان کو نبی کیسے مان لیں! ہم تو پھر بہت گھٹیا ہو جائیں گے' ہماری علمیت' ہماری سیادت' ہماری قیادت ختم ہو جائے گی۔ ان کا یہ استکبار اور پندار اُن کے قبولِ حق کی راہ میں آڑے آ گیا۔

نبی اکرم ﷺ کی تشویش

اس پس منظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنی دعوت کے نتیجے کو دیکھ کر کچھ تشویش میں ہیں کہ لوگ کیوں ایمان نہیں لا رہے! آخر انہیں کیا ہو گیا ہے! میری دعوت کتنی صاف اور سادہ ہے' کتنی مطابق فطرت ہے' انسان کی فطرت کی بدیہیات کو اپیل کرنے والی ہے ـــــ! پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ ایمان نہیں لا رہے؟ اس پس منظر کو پیش نظر رکھئے اور اگلے حصے کو پڑھئے۔ فرمایا :

﴿ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ ﴾ (الشوریٰ : ۱۳)

"(اے محمد ﷺ!) بہت بھاری ہے مشرکین پر وہ چیز جس کی طرف آپ انہیں بلا رہے ہیں۔"

آپ اسے سادہ بات سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ دعوتِ توحید ان کے رائج نظام کو درہم برہم اور تلپٹ کر دینے والی ہے' کیونکہ ان کا پورا نظام شرک پر قائم ہے' ان کے مفادات اس کے ساتھ وابستہ ہیں' ان کی چودھراہٹیں اسی مشرکانہ نظام کی رہین منت ہیں۔

مشرکانہ نظام سے وابستہ مفادات

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ دعوتِ توحید ہزار مطابق فطرت ہو' لیکن اس کے جو لوازم' مقتضیات اور متضمنات ہیں ان کو وہ لوگ خوب سمجھتے ہیں جو مشرکانہ نظام میں قیادت وسیادت کے مناصب پر فائز ہوتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اس دعوتِ توحید کی ان کے مفادات پر کہاں کہاں ضرب پڑتی ہے! دیکھئے اگر کسی بُت کا استھان ہے اور لوگ وہاں آ کر چڑھاوے چڑھاتے ہیں تو کیا وہ بُت کے پیٹ میں جاتے ہیں؟ وہ تو مجاوروں کے پیٹوں میں جاتے ہیں۔ وہاں کے جو پجاری اور Priests ہیں سارے چڑھاوے تو ان کو مل رہے ہیں۔ کہنے کو وہ بُت پر چڑھاوا ہے۔ اسی طور پر جو چڑھاوے قبروں پر چڑھائے جاتے ہیں' ان کے متعلق آپ نے

کبھی سوچا کہ وہ کہاں جاتے ہیں؟ وہ سب مجاوروں اور گدی نشینوں کے پاس جاتے ہیں۔ وہ تو جب سے محکمہ اوقاف قائم ہوا ہے تو ایسی درگاہوں پر مقفل صندوق رکھ دیئے گئے ہیں کہ نقد نذر و نیاز ان میں ڈالی جائے۔ لیکن شاید آپ کو معلوم ہو کہ جب محکمہ اوقاف کا نظام زیر ترتیب تھا اسی دوران بڑی بڑی درگاہوں کے جو حضرات پشتی سجادہ نشین تھے' وہ ان زمینوں کو جو درگاہوں اور مقبروں کے نام وقف تھیں' اپنے ناموں پر منتقل کرا چکے تھے۔ گویا اصل دولت تو محکمہ اوقاف کے سرگرم عمل ہونے سے قبل ہی وہاں سے جا چکی تھی۔ یہ بڑے بڑے پیر جو بڑے بڑے زمیندار اور وڈیرے بنے نظر آتے ہیں' وہ کہاں سے بنے ہیں؟ انہی زمینوں کی بدولت بنے ہیں جو ان مقبروں اور درگاہوں کے نام وقف کی گئی تھیں اور اب وہ ان کی ذاتی ملکیت بنی ہوئی ہیں ــــــ پس معلوم ہوا کہ شرک کا پورا نظام ہوتا ہی ہے مفادات کا ــــــ اس نظام میں تو صرف اوپر کی دکھاوے کی چیزیں ہوتی ہیں کہ یہ منادر و مقابر ہیں ــــــ یہ دیوتا اور دیویوں کے بت ہیں' یہ اولیاء اللہ کی قبور ہیں۔ اصل مقصد تو ان ناموں' ان استھانوں اور ان درگاہوں کی آڑ میں قیادت و سیادت اور حصولِ دولت ہوتا ہے۔ سومنات کے مندر کے اندر جو دولت تھی وہ کس کی ملکیت تھی؟ وہاں کے پجاریوں کی ملکیت تھی! لہٰذا مشرکین کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ نظامِ توحید قائم و نافذ ہو۔

آیت کے اس حصہ کے بین السطور نبی اکرم ﷺ کو تسلی و تشفی دی جا رہی ہے کہ اے نبی (ﷺ)! ٹھیک ہے کہ آپؐ جو دعوت دے رہے ہیں وہ فطرت کے مطابق اور بالکل سیدھی بات ہے ــــــ توحید سے بڑھ کر سیدھی بات اور کون سی ہو گی! توحید کے سوا مطابق فطرت بات کون سی ہو گی! توحید سے بڑھ کر مطابق عقل بات کون سی ہو گی! لیکن کسی بات کا مطابق فطرت و عقل ہونا اس کے قابل قبول ہونے کے لئے کافی نہیں۔ یہاں تو مسئلہ آتا ہے مفادات کا' چودھراہٹ کا' اس بات کا کہ مسند اور سجادہ محفوظ رہتا ہے کہ نہیں! وجاہت اور قیادت پر تو آنچ نہیں آ رہی! اور

ظاہر بات ہے کہ دعوتِ توحید ان تمام بتوں کو' خواہ وہ مٹی اور پتھر کے ہوں' خواہ مفادات' قیادت اور سیادت کے ہوں' توڑ پھوڑ کر اور ملیامیٹ کر کے رکھ دیتی ہے۔ لہٰذا مشرکین پر یہ دعوت بہت بھاری ہے۔ یہ اسے آسانی سے ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا فرمایا :

﴿ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ﴾ (الشوریٰ : ۱۳)

"مشرکین پر یہ چیز بہت بھاری ہے جس کی طرف آپ انہیں بلا رہے ہیں۔"

اضطراب کا فطری سبب

ایک کریم اور شریف النفس انسان جبکہ رسالت کی ذمہ داری بھی اس کے سپرد ہو' یہ سوچتا ہے کہ کہیں میرے اندر تو کوئی نقص نہیں! لوگ جو ایمان نہیں لا رہے تو میری کوشش میں تو کوئی کمی نہیں! میری محنت میں تو کوئی کوتاہی نہیں! دعوت دینے کے میرے انداز میں تو کوئی خامی نہیں! انبیاء و رُسل علیہم السلام تو اس بارے میں بے نہایت تشویش میں مبتلا ہوتے ہیں کیونکہ ان کو یہ ضابطۂ الٰہی معلوم ہوتا ہے کہ : ﴿ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ ﴾ (الاعراف : ٦) "پس یہ لازماً ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں گے کہ جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے ہیں اور رسولوں سے بھی پوچھ کر رہیں گے۔" یعنی یہ کہ انہوں نے رسالت کے فرضِ منصبی کو کہاں تک اور کس طرح انجام دیا؟ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تشویش ہوتی تھی کہ کہیں میری کوئی کوتاہی نہ ہو جس کے باعث مجھے اللہ کے ہاں جواب دہی کرنی پڑ جائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دلجوئی

قرآن مجید میں بار بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف اسالیب سے جو تسلی دی گئی ہے اور آپ کی دلجوئی فرمائی گئی ہے وہ اسی لئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ایمان نہ لانے پر تشویش میں مبتلا ہو کر اپنی جان کو نہ گھلائیں : ﴿ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا

مُؤْمِنِيْنَ○ ﴾ (الشعراء : ۳) "(اے نبی!) شاید آپ (رنج 'صدمے 'تشویش اور غم میں) اپنی جان کھو دیں گے کہ یہ لوگ ایمان (کیوں) نہیں لاتے "۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ﴿ فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ○ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ ﴾ (الروم : ۵۲ '۵۳) "(اے نبیؐ!) آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے نہ بہروں تک اپنی دعوت پہنچا سکتے ہیں جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں 'اور نہ ہی آپ اندھوں کو سیدھا راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہیں "۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ : ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ ﴾ (البقرۃ : ۷) "(ان کے کفر پر اڑے رہنے کے باعث) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے اور ان کے کانوں اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے "۔ بظاہر یہ چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں 'لیکن حقیقت میں یہ مر چکے ہیں 'ان کی معنوی موت واقع ہو چکی ہے۔ بظاہر ان کے پاس سماعت بھی ہے 'بصارت بھی ہے 'لیکن معنوی اعتبار سے یہ بہرے اور اندھے ہیں۔ یہ چلتے پھرتے مقبرے ہیں 'چلتے پھرتے حیوانات ہیں۔ ان کے اندر کا انسان مر چکا ہے ـــــ آپ کی تبلیغ و دعوت میں کوئی کمی نہیں ہے 'لہٰذا آپ تشویش نہ کریں 'آپ یہ فکر دامن گیر نہ کریں کہ یہ ایمان کیوں نہیں لا رہے!!

راہِ ہدایت پر آنے کے دو طریقے

اس آیت مبارکہ کے آخری حصے میں علمی اعتبار سے ایک اہم مضمون آ رہا ہے' جسے ذہن نشین کرنا ضروری ہے :

﴿ اَللّٰهُ يَجْتَبِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ ﴾

(الشوریٰ : ۱۳)

"اللہ ہی کھینچ لیتا ہے اپنی طرف جسے چاہتا ہے' اور ہدایت دیتا ہے اپنی جانب اس کو جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔"

یہ بڑی اہم بات ہے۔ کسی شخص کے راہِ ہدایت پر آنے کے دو طریقے ہیں۔ یہ مختلف طبائع اور مزاج کی بات ہو رہی ہے۔ بعض لوگوں کو تو اللہ ہی فیصلہ کر کے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور بعض لوگ محنت و کوشش کر کے اور رجوع کر کے اللہ کے راستے کی طرف آتے ہیں۔

اِجتباء

اللہ تبارک و تعالیٰ کی شان یہ بھی ہے کہ وہ چاہے تو کسی راہ چلتے کو بلا لے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدین سے مصر جا رہے تھے کہ راستہ ہی سے کھینچ بلایا اور کوہِ طور پر نبوت و رسالت سے سرفراز فرما دیا۔ آپؑ سے کلام فرما دیا : ﴿ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴾ وہ کلیم اللہ ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر سے ننگی تلوار لے کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے پختہ ارادے سے نکلے تھے' لیکن راستہ ہی سے ان کا رخ اپنی ہمشیرہ کے گھر کی طرف پھیرنے کے اسباب پیدا فرما دیئے' جو خود اور ان کے شوہر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہما ایمان لا چکے تھے۔ بہن کی عزیمت دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دل موم ہوا۔ کلامِ الٰہی سننے کی خواہش کی اور سن کر دل کی کایا پلٹ

گئی' حجابات دُور ہو گئے۔ وہی ننگی تلوار جو قتل کے ارادے سے لے کر گھر سے نکلے تھے' غلاموں کی طرح گلے میں ڈال کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف باسلام ہو کر جان نثارانِ محمد ﷺ میں شامل ہو گئے اور دربارِ نبویؐ سے فاروق کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا بھی اجتباء ہوا۔ آنحضور ﷺ کو مکہ میں دعوتِ توحید دیتے ہوئے چھ سال بیت گئے تھے۔ آپ کی شدید مخالفت ہو رہی تھی' لیکن حمزہ ان سب سے بے نیاز اپنے مشاغل میں لگے رہتے تھے' جن میں نمایاں شوق تیر کمان لے کر علی الصبح شکار کو نکل جانا اور شام کو واپس آنا تھا۔ ایک شام جب واپس آئے تو لونڈی نے اس زیادتی کا ماجرا سنایا جو اس روز ابو جہل نے آنحضور ﷺ کے ساتھ کی تھی۔ قرابت داری کے جذبے نے جوش کھایا۔ پہلے تو جا کر کمان سے ابو جہل کا سر پھاڑا اور کہا لو میں بھی محمد (ﷺ) پر ایمان لاتا ہوں' پھر حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر فی الواقع مشرف باسلام ہوئے۔ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ وَاَرْضَاہُ۔ اَسَدُ اللّٰہِ وَاَسَدُ رَسُوْلِہٖ اور سیّد الشہداء کے القاب سے ملقب ہوئے۔

انابت

دوسری قسم کے لوگ خود ہدایت کے طالب ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ جو ہدایت کا طالب ہے اسے ہم ہدایت دیں گے۔ اس نے تو گویا ہم پر اپنا حق قائم کر دیا۔ اس لئے کہ وہ خود طالب ہدایت ہے۔ ﴿ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ﴾ (العنکبوت : ۶۹) جو لوگ ہمارے لئے محنتیں کریں' کوشش کریں' ہدایت کے طالب بنیں' اس کے لئے قربانیاں دیں ان کے لئے ہمارا پختہ وعدہ ہے کہ ہم انہیں لازماً اپنے راستہ کی ہدایت دیں گے ـــــ یہی بات یہاں فرمائی کہ ﴿ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ ﴾ "اللہ ہدایت دیتا ہے اپنی جانب اس کو جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔" جو بھی حق کا طالب اور

متلاشی ہے' جس کے دل میں بھی انابت ہے' جس میں حق کی طلب صادق ہے' جو کسی تعصب اور عصبیت میں مبتلا نہیں ہے اسے اللہ تعالیٰ راہِ ہدایت دکھاتا ہے اور اس پر اس کو لے آتا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس کی درخشاں مثال ہیں۔ وہ اپنی فطرتِ سلیمہ اور طلبِ حق کی بنیاد پر صدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے مقام ارفع پر فائز ہوئے۔ عشرہ مبشرہ میں اکثر وہی حضراتِ گرامی شامل ہیں جو راہِ حق کے از خود جویا تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہیں جو طلب حق میں کہاں سے روانہ ہوئے' کن کن منازل پر ٹھہرے اور پھر کس طرح دامن محمدیؐ سے وابستہ ہوئے! یہ انابت الی اللہ کی درخشاں مثالیں ہیں۔

صوفیاء کی دو اصطلاحات : سالک مجذوب اور مجذوب سالک

ہمارے یہاں صوفیاء میں دو اصطلاحیں رائج ہیں۔ ان کے نزدیک کچھ ہوتے ہیں سالک مجذوب اور کچھ ہوتے ہیں مجذوب سالک۔ سَلَکَ عربی کا لفظ ہے' اس کے معنی ہیں چلنا ــــ لہٰذا سلوک کے معنی راستہ کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح طریق اور طریقت بھی چلنے اور راستہ کو کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک سالک مجذوب وہ ہیں جو خود چل کر اللہ کی طرف آتے ہیں اور اللہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ بھی لیتا ہے' انہیں ہدایت دیتا ہے' اس لئے کہ انہوں نے رجوع کیا ہے ــــ جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ' وہ تو پہلے سے حق کے متلاشی ہیں' اسی راستے پر چلے آ رہے ہیں' حقیقت کے دروازے پر وہ بھی دستک دے رہے تھے۔ یہ الگ حقیقت ہے کہ دروازہ کھلا جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے۔ اسی لئے انہوں نے فوراً تصدیق کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لے آئے۔ انہیں تصدیق کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کو میں نے دعوت پیش کی ہو اور اسے کچھ نہ کچھ تردد نہ ہوا ہو اور اس نے کچھ نہ کچھ توقف نہ کیا ہو' سوائے ابو بکر کے ــــ رضی اللہ عنہ ــــ وجہ یہ تھی کہ

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا!

دوسرے درجے پر ہیں مجذوب سالک۔ یہ وہ ہیں جن کو پہلے اللہ تعالیٰ خود ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور انہیں ہدایت دیتا ہے' پھر ان کو تربیت کے مراحل سے گزارا جاتا ہے' جیسے حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما۔

یہ مفہوم ہے سالک مجذوب اور مجذوب سالک کا ــــــ صوفیاء نے یہ اصطلاحات شاید آیت کے اسی حصّہ سے اخذ کی ہیں کہ : ﴿ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴾ "اللہ جسے چاہے چن کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور جو خود اس کی طرف رجوع کرے تو اللہ اسے لازماً ہدایت دیتا ہے۔"

اہلِ ایمان کو تسلّی

آیت کے اس حصے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے توسط سے اہل ایمان کے لئے تسلی و تشفی کا پہلو بھی موجود ہے کہ مکّہ کے مشرکین کی شدید مزاحمت و مخالفت اور جور و تعدی نیز انتہائی مایوس کن حالات سے دل برداشتہ نہ ہوں ــــــ اللہ تعالیٰ راستہ کھولے گا اور وہ تبارک و تعالیٰ کچھ لوگوں کو اپنے دین کی طرف کھینچ لے گا اور ان مشرکین میں جو نیک سرشت ہوں گے' جن کی فطرت سلیم ہو گی' جن کی عقل سلیم ہو گی' جن میں ذرا بھی انابت ہو گی وہ خود چل کر آ جائیں گے۔ اللہ ان کو بھی راہِ ہدایت سے بہرہ مند فرمائے گا۔

اہلِ کتاب کی مخالفانہ روش کا اصل سبب

اب آگے والی آیت میں دوسری جماعت یعنی اہل کتاب کی مخالفت کے سبب کو اختصار لیکن انتہائی جامعیت و بلاغت سے بیان فرمایا جا رہا ہے۔ مشرکین عرب تو بے علم تھے' اَن پڑھ تھے' ان کے پاس شریعت نہیں تھی' وحی' نبوت و رسالت اور انزالِ کتب سماوی سے بالکل ناآشنا تھے۔ ان کے مقابلہ میں یہود اور ان کے علماء و فضلاء تھے۔ ان کے پاس کتاب بھی تھی اور شریعت بھی' وحی اور انزالِ کتب سماوی سے وہ واقف تھے' سلسلۂ نبوت و رسالت سے وہ آشنا تھے' توحید سے وہ روشناس تھے' بعث بعد الموت کے وہ قائل تھے' حساب کتاب اور جنت و دوزخ کے وہ اقرار کرنے والے تھے۔ ان کے لئے تو جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ توحید میں کوئی اجنبیت نہیں تھی' کوئی نرالی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ تو خود نبی آخر الزمان ﷺ کے ظہور کے منتظر تھے۔ جن کتابوں کو وہ خود آسمانی کتابیں تسلیم کرتے تھے ان میں یہ پیشین گوئیاں موجود تھیں کہ خاتم النبیین والمرسلین کی بعثت فاران کی چوٹیوں اور کھجوروں کے جھنڈ کی سرزمین میں ہو گی۔ وہیں ان کا ظہور ہو گا جس سے مراد حجاز کے علاقہ کے سوا کوئی دوسرا مقام نہیں ہو سکتا۔[1] حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک عیسائی راہب سے یہ اطلاع پا کر ہی حجاز کے لئے عازمِ سفر ہوئے تھے ——— پھر یہود اوس و خزرج کو دھمکیاں دیتے تھے کہ آخری نبی کے ظہور کا زمانہ قریب ہے' جب ہم ان کی زیرِ قیادت تم سے جنگ کریں گے تو لازماً تم پر غالب آئیں گے۔ لیکن قرآن شہادت دیتا ہے کہ یہ یہود آنحضور ﷺ کی مخالفت میں مشرکین سے بھی زیادہ شدید

---

[1] ممکن ہے کہ اسی وجہ سے یہود کے تین بڑے قبیلے فلسطین اور شام کے علاقے چھوڑ کر مدینہ اور خیبر میں آ کر آباد ہوئے ہوں اور اوس و خزرج کے قبیلوں کو نبی آخر الزمان ﷺ کے ظہور کی خبریں دیتے ہوں۔ (مرتب)

تھے' اور آپؐ کی دعوتِ توحید کے خلاف قریش اور عرب کے دوسرے قبائل سے ریشہ دوانیوں اور سازشیں کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ فتنہ و فساد کو اکسانے میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان کی مخالفت کے سبب کو اگلی آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

اس آیت مبارکہ کے بھی "شَرَعَ لَكُمْ" والی آیت کی طرح دو حصے ہیں' جن کی وضاحت علیحدہ علیحدہ کی جائے گی۔

﴿ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۭ ﴾

"اور ان لوگوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس حال میں کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا (بلکہ تفرقہ کا سبب یہ تھا) کہ وہ ایک دوسرے سے زیادتی کریں۔"

سیاقِ کلام سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ آیت کے اس حصے میں اہلِ کتاب کے تفرقہ کا ذکر ہے۔ اسی آیت کے آخری حصہ میں وراثت کتاب کا ذکر آ رہا ہے۔ وارثِ کتاب تو یہود و نصاریٰ ہی تھے۔ آیت کے اس حصہ میں تفرقہ کا سبب نہایت جامعیت اور بلاغت سے بیان ہو رہا ہے کہ ان اہل کتاب نے جو تفرقہ کیا' وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور منقسم ہو گئے تو اس کا باعث لاعلمی نہیں' بلکہ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ہے ـــــ دیکھئے کتنی عجیب بات ہے' دین و شریعت ایک ہے' یہود و نصاریٰ دونوں تورات کے ماننے والے ہیں' پھر بھی تفرقے میں مبتلا ہیں۔ پھر تفرقہ در تفرقہ ہے۔ یہود بھی مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور نصاریٰ بھی' اور ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں[1]' حالانکہ ان کی پوری تاریخ مشترک ہے۔ آج بھی عیسائی جس کتاب کو بائیبل کہتے ہیں اس کا بڑا حصہ تو "عہد نامہ عتیق" (Old Testament) ہے۔ یہ دراصل تورات اور دوسرے انبیاءِ بنی اسرائیل کے صحیفوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد "عہد نامہ جدید" (New Testament) ہے' جس میں چار

---

[1] موجودہ دور میں صرف اسلام دشمنی میں عیسائی ان یہود کے حامی' پشت پناہ اور حلیف بن گئے ہیں' درآنحالیکہ ان کے عقیدے کے مطابق حضرت مسیح کو صلیب پر چڑھوانے والے یہودی تھے۔ (مرتب)

کتابیں وہ ہیں جو "اناجیلِ اربعہ" کہلاتی ہیں۔ ان کے بعد پال اور دوسروں کے خطوط ہیں، جن کو وہ "رسولوں کے خطوط" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہودی جن انبیاء کو مانتے ہیں عیسائی بھی ان سب کو مانتے ہیں، لیکن باہمی تفرقہ ہے —— ایک دوسرے کے خلاف فتوے ہیں —— یہ سب کیوں اور کس لئے ہے؟ اس لئے کہ جب بھی کوئی توحید کی خالص دعوت لے کر اٹھے گا حالات یہی ہوں گے۔ یہ صورتِ حال کبھی نہیں بدلے گی۔ بقول علامہ اقبال ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!

آج بھی اگر تجدید و احیاءِ دین کے لئے اور خالص دعوتِ توحید کے لئے کمر کس کر کوئی قافلہ چلے گا تو اسے اسی نوع کے دو گروہوں سے واسطہ پڑے گا اور سابقہ پیش آئے گا۔ جیسے دورِ حاضر میں ایک تو ہمارے عوام الناس ہیں کہ جن کو دین کی کوئی خبر نہیں۔ ان کے نزدیک دین نام ہے محض ایک عقیدے اور چند رسومات کا۔ ان کو حقیقی دین کا علم سرے سے ہے ہی نہیں۔ ان کا دین تو قبر پرستی ہے یا تعزیہ پرستی۔ ان کے دین کا سب سے بڑا مظہر عرس ہے یا تعزیوں کے جلوس ہیں، یا اب ایک اور جلوس کا اضافہ ہو گیا ہے جو عید میلاد النبی ﷺ کا جلوس ہے۔ ان کا دین تو ان ہی چیزوں کا نام ہے۔ ان کے سوا ان کو دین کا اور کوئی علم اور خبر ہے ہی نہیں۔ نماز سے انہیں سروکار نہیں، روزے سے انہیں بحث نہیں —— ان کا کُل کا کُل دین بس ان چیزوں کا نام ہے۔ یہ گروہ تو گویا ان لوگوں کے مشابہ ہو گیا جو حقیقتِ نفس الامری سے بہت دُور نکل گیا تھا ﴿ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ ان کے لئے خالص توحید والے دین کی طرف آنا بڑا ہی مشکل ہے، آسان کام نہیں ہے، الاّ ماشاء اللہ۔

ہمارے یہاں دوسرا گروہ وہ ہے جن کے فتوے چلتے ہیں، دین کے مسائل کے لئے جن کی طرف لوگوں کا رجوع ہے، جن کی دینی مسندیں ہیں، جن کے اونچے اونچے مناصب ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر جن کا سرکار دربار سے ربط و تعلق قائم ہو جائے وہ تو یوں سمجھئے کہ "کریلا اور نیم چڑھا" کے مصداق ہیں۔ ان میں جو جو

خرابیاں پروان چڑھتی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ علمائے سُوء کی اکثریت بھی اکثر و بیشتر ان ہی میں سے ہوتی ہے جو سرکاری درباری علماء ہوتے ہیں۔ ایسے ہی علمائے سُوء کے فتووں سے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی پیٹھ پر کوڑے برستے رہے ہیں۔ ایسے ہی علماء کے فتووں سے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو جیل میں ڈالا گیا۔ ان ہی کے فتووں سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیل میں ڈالے گئے اور ان کو کوڑے لگائے گئے۔ جب امام مالکؒ کی مُشکیں کس کے کوڑے لگے ہیں اور گدھے پر بٹھا کر ان کی مدینہ کی گلیوں میں جو تشہیر کی گئی ہے تو کیا اس کی پشت پر اس وقت کے درباری مفتیان کے فتوے موجود نہیں تھے؟ یہ درباری سرکاری اقتدارِ وقت کے مُنہ چڑھے ہی تو عالم و فاضل لوگ تھے جنہوں نے جلال الدین اکبر کو "دینِ الٰہی" عطا کیا تھا۔ اکبر کا تو باپ بھی دین الٰہی خود تجویز نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو مرتب کرنے والے تو ابو الفضل اور فیضی تھے جو بہت بڑے عالم تھے۔ اتنے بڑے عالم کہ ابو الفضل نے قرآن مجید کی پوری تفسیر اس طور پر لکھ دی کہ اس میں کوئی نقطہ والا حرف نہیں آیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حال ہی میں سیرتِ مطہرہ پر ایک ایسی کتاب بھی لکھی گئی ہے جس میں نقطہ والا کوئی حرف نہیں آیا' جس کی صدرِ مملکت کی جانب سے بڑی مدح کی گئی ہے۔ یہ تو سیرت کی کتاب ہے' ابو الفضل نے تو قرآن کی پوری تفسیر لکھی کہ جس میں کوئی نقطہ والا حرف نہیں آیا۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ اس تفسیر پر علماء نے کوئی نکیر کی ہو۔ ممکن ہے کہ تفسیر میں اس نے کچھ گڑبڑ نہ کی ہو لیکن یہ وہی شخص ہے جو اکبر کے لئے "دین الٰہی" تصنیف کر رہا ہے اور اکبر کی اس راہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔[1] لہٰذا جب بھی منظم طور پر توحید کی دعوت اٹھے گی یہ دو طرفہ

---

[1] امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن مجید کا جب فارسی میں ترجمہ کیا تھا تو وقت کے علماء نے شاہ صاحب کے خلاف کفر کا فتویٰ دے دیا تھا۔ چنانچہ عوام کے ایک گروہ نے اسی فتویٰ سے متاثر ہو کر شاہ صاحب پر دہلی کی جامع مسجد فتح پوری میں ان کو قتل کرنے کے لئے یلغار بھی کی تھی' لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا تھا۔ (مرتب)

یلغار ہو گی' مخالفتیں ہوں گی' ابتلاء اور آزمائشیں اسی طور سے آئیں گی جیسے اس وقت آئی تھیں۔

آیت کے اس حصہ کے عمومِ لفظ کے بین السطور اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ ہیں وہ مراحل وادوار جو خالص دعوتِ توحید کے نتیجے میں ہمیشہ آکر رہیں گے۔ ایک وہ عوام' جہلاء جو دین سے دُور نکل گئے' ان کو دین سے کوئی سروکار ہی نہیں' کوئی تعلق ہی نہیں۔ سوائے بدعات' رسومات اور خرافات کے وہ دین سے کوئی واسطہ اور علاقہ رکھتے ہی نہیں۔ ایک وہ جن کا پڑھنا پڑھانا بھی ہے' دین سے تعلق بھی ہے' مسندیں بھی ہیں' فتاویٰ بھی ہیں' ارشاد بھی ہے' سب کچھ ہے' لیکن الا ماشاء اللہ حال یہ ہے کہ : ﴿ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۭ ﴾

تفرقے کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ حق جب آئے تو وہ واضح نہ ہو' گنجلک ہو۔ تو اس کی اس آیت کے آغاز میں نفی کر دی گئی ہے کہ :

﴿ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ﴾

پس معلوم ہوا کہ تفرقہ کا باعث لاعلمی اور ناواقفیت نہیں ہے۔ "العلم" ان تک پہنچ چکا تھا۔ ہدایت ربانی اور حق جب بھی آیا ہے بہت مبرہن' واضح اور بینہ بن کر آیا ہے۔ آخری پارے کی سورۃ البینہ میں یہ مضمون آیا ہے۔ فرمایا : ﴿ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴾ "جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی انہوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس "البینہ" آ گئی تھی"۔ یعنی حق روشن و مبرہن صورت میں ان کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ ان اہل کتاب نے اندھیرے میں ٹھوکر نہیں کھائی' بلکہ روزِ روشن میں جان بوجھ کر وہ راہِ حق سے منحرف ہوئے ہیں۔ ٹھیک ہے اہل عرب نے ٹھوکر کھائی' مکہ والوں نے ٹھوکر کھائی تو اندھیرے میں کھائی۔ ان کے پاس تو روشنی تھی ہی نہیں۔ لیکن یہود تو اندھیرے میں نہیں تھے۔ وہ تو نبی اکرم ﷺ اور قرآن کو ایسے پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو

﴿ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ ﴾ —— پھر بھی ایمان نہیں لا رہے۔ کیوں؟ اس کو آیت کے اس حصے کے آخر میں بیان کیا گیا : ﴿ بَغْیًا بَیْنَهُمْ ﴾ اس تفرقے کا اصل محرک ہے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خواہش اور کوشش' ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی تمنا اور سعی' ایک دوسرے پر ور آنے کی فکر۔ پھر قومی و گروہی مفادات' مناصب' تفاخر' وجاہت و حشمت' مذہبی قیادت و سیادت' ان پر مستزاد ہے۔ تکبر اور حسد کہ یہ فضیلت بنی اسمٰعیل کو کیوں مل گئی' یہ تو ہمارے خاندان کی میراث ہے۔ ڈھائی ہزار برس تک نبوت کا سلسلہ ہمارے یہاں جاری رہا ہے' کسی اور کو یہ فضیلت مل جائے' یہ ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں یہ Personality Clash یعنی شخصیتوں کا تصادم تھا' کون اوپر اور کون نیچے کا جھگڑا تھا۔ بالاتر کون ہے اور کم تر کون! یہ سارا فساد دراصل اس کا تھا۔ یہ لوگوں کی انانیت تھی جس کے باعث وہ تفرقے میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنی دُنیوی اغراض اور مصالح کی خاطر حق سے اعراض ہی نہیں بلکہ اس کی مخالفت اور دشمنی پر کمر کس رکھی تھی۔ اب ان تمام تشریحات و تصریحات کے ساتھ آیت کے اس حصے کو پھر دیکھ لیجئے : ﴿ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًا بَیْنَهُمْ ﴾

اب آیت کے دوسرے حصے پر توجہ مرکوز کیجئے :

﴿ وَلَوْ لَا کَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی لَّقُضِیَ بَیْنَهُمْ ﴾

"اور اگر (اے محمد ﷺ!) آپ کے رب کی طرف سے ایک کلمہ طے نہ ہو چکا ہوتا' ایک وقت معین تک کے لئے بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے مابین قصہ چکا دیا جاتا۔"

یعنی ابھی مہلت عمر ہے۔ افراد کو بھی اس وقت تک کے لئے مہلت ہوتی ہے جب تک موت نہیں آتی۔ ((مَا لَمْ یُغَرْغِرْ)) جب تک موت کا گھونگرو نہیں بولتا توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ ہر نفس کے لئے یہ ضابطہ مقرر ہے کہ ﴿ وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا

جَآءَ اَجَلُهَا ﴾ "اللہ کسی کو قطعاً مہلتِ عمل نہیں دیتا جب موت کا مقررہ وقت آجاتا ہے"۔ اجل مسمّٰی کے اندر اندر عمل کا اختیار ہے۔ یہ مہلت و اختیار نہ ہو تو پھر آزمائش کیسی؟ بالجبر اگر اللہ ہدایت دے دے تو اس ہدایت پر انعام کیسا؟ بالجبر کسی کو غلط راستے پر ڈال دے تو اس کی سزا چہ معنی دارد؟ لہٰذا اللہ عزوجل یہ اختیار اور مہلت دیتا ہے' افراد کو بھی اور امتوں کو بھی۔ چنانچہ فرمایا کہ ہماری طرف سے مہلت کا ضابطہ پہلے ہی سے مقرر ہے۔ ابھی ان کو ڈھیل دینی ہے' ابھی ان کے لئے مہلتِ عمل ہے' ابھی ان کو اختیار حاصل ہے جدھر چاہیں جائیں۔ ﴿ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴾ اور یہ کہ ﴿ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ اگر ہمارا یہ ضابطہ اور قانون نہ ہوتا' ہماری یہ سُنّت نہ ہوتی تو ہم ان کا قصہ چکا دیتے' ابھی جھگڑا طے کر دیتے' دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کر دیتے۔

آیت کے اس حصّے میں نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے توسط سے اہلِ ایمان کے لئے بھی تسلی کا ایک پہلو موجود ہے کہ تشویش نہ کیجئے' ابھی وقت لگے گا' اللہ کا آخری فیصلہ آکر رہے گا' احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہو کر رہے گا اور انجامِ کار کے طور پر سب کو ہمارے حضور حاضر ہونا ہی ہے۔ وہ فیصلہ کی آخری ساعت بھی آکر رہے گی ــــــ اجل مسمّٰی تک آپ بھی انتظار کیجئے اور مخالفین بھی۔

وارثینِ کتاب کا نقشہ

اب اس آیت کے آخری حصہ پر آیئے! فرمایا :

﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴾

"اور وہ لوگ جو کتاب کے وارث بنائے گئے' ان کے بعد در حقیقت وہ اس (کتاب) کے بارے میں ایسے شک و شبہ میں مبتلا ہو چکے ہیں جس نے ان کے دلوں میں خلجان پیدا کر دیا ہے۔"

آیت کے اس ٹکڑے کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے ـــــ یوں تو قرآن مجید کا ہر لفظ اور ہر آیت عظمت کی حامل ہے' لیکن میرا گہرا تاثر ہے کہ سورۂ شوریٰ کی یہ تین آیات قرآن کی عظیم ترین آیات میں سے ہیں۔ اقامت دین کی جدوجہد میں جو بھی مسائل (Problems) سامنے آتے ہیں ان سب کا حل اور جواب تین آیات میں موجود ہے۔ جب کبھی یہ کوشش ہوگی تو اس وقت جو مسائل اٹھیں گے ان سب کے لئے یہاں رہنمائی موجود ہے۔ فرمایا : ﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ○ ﴾ رسولوں کے اُمّتی حاملین کتاب تشکیک میں مبتلا ہو چکے ہیں' جس نے ان کے اذہان و قلوب میں خلجان اور انتشار پیدا کر دیا ہے۔ یہ کتاب کے ماننے اور جاننے والوں کا حال ہے۔ جو اُمّیین ہیں ان کی کیفیت یہ نہیں ہے' اس لئے کہ ان کے پاس تو سرے سے کوئی کتاب ہے ہی نہیں۔ یہ گفتگو درحقیقت اہلِ کتاب کے بارے میں ہو رہی ہے کہ جن کے پاس علم' کتاب اور شریعت موجود ہے۔ وہ سب ایک رسول کے نام لیوا ہیں' لیکن آپس میں دست و گریبان ہیں۔[1] نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آئندہ نسلوں کا اعتماد ہی اٹھتا چلا جاتا ہے ـــــ آج ہم جو دیکھ رہے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل کا دین سے اعتماد ہی اٹھتا چلا جا رہا ہے' وہ کیوں؟ اس لئے کہ ان کا روز کا مشاہدہ ہے کہ ملک کے علماء حضرات کی اکثریت جو دین کے نام لیوا ہیں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں' الا ماشاء اللہ۔ سب کہتے یہی ہیں کہ ہمارا مقصد ہے کہ دین کو قائم کیا جائے' اسلامی نظام بالفعل نافذ ہو' لیکن ایک دوسرے کی ٹانگیں گھسیٹی جا رہی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا منفی اثر ہمارے معاشرے پر پڑ رہا ہے۔ لوگ اندھے بہرے تو نہیں ہیں۔ نوجوان بڑے حساس ہوتے ہیں۔ تفرقہ کا یہ نقشہ دیکھ کر انہیں پھر دین ہی کے بارے میں شک پڑ جاتا ہے اور سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید

---

[1] اشارہ ہے یہود و نصاریٰ کے متعدد فرقوں کی طرف۔ (مرتب)

دعویٰ کرتا ہے کہ ﴿ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ ﴾ لیکن ایک نوجوان کسی کو دیکھتا ہو کہ نمازی تو بڑا پکا ہے' لیکن جتنا پکا نمازی ہے اتنا بڑا بلیک مارکیٹر بھی ہے تو اس کا اعتماد نماز پر قائم ہو گا یا ہٹے گا' ظاہر ہے نماز پر سے اعتماد ہٹے گا' قرآن پر سے اعتماد ہٹے گا کہ قرآن تو دعویٰ کر رہا ہے کہ نماز بڑے کام سے روکنے والی شے ہے اور یہ شخص سب کچھ کر رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نمازی بڑا پکا ہے۔ ایسے ہی ہمارے معاشرے میں وہ لوگ بھی ہیں جو کثرت کے ساتھ حج و عمرہ کرتے ہیں' لیکن ساتھ ہی اسمگلر بھی ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کے باعث نوجوانوں کا دین پر سے اعتماد اٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔

اسی غلط طرزِ عمل کی عکاسی کی گئی ہے آیت کے اس حصہ میں : ﴿ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْ بَعْدِھِمْ ﴾ "اور جو لوگ وارث بنائے گئے کتاب کے ان کے بعد"۔ یہاں "ان کے بعد" سے کیا مراد ہے! وہ لوگ جو تفرقے ڈال کر چلے گئے' اب ان کے بعد اگلی نسل کتابِ الٰہی کی وارث ہوئی —— جیسے ہم قرآن حکیم کے وارث ہیں —— یہاں جو ذکر ہو رہا ہے وہ تورات اور انجیل کا ہو رہا ہے۔ لیکن جو لوگ تفرقے ڈال گئے تو ان کے بعد آنے والے ان تفرقوں کے سبب سے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے۔ ﴿ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مُرِیْبٍ ۝ ﴾ یہاں مریب شک کی صفت ہے۔ یعنی شک جب دل میں یہ خلجان پیدا کر دے کہ پتہ نہیں کچھ ہے بھی یا نہیں؟ واقعتاً یہ کتابِ الٰہی ہے کہ نہیں؟ یہ گروہ بھی اسی کتاب کو ماننے کا مدعی اور وہ گروہ بھی اسی کتاب کے ماننے کا مدعی' یہ بھی اسی کتاب کو پڑھ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ روشنی کا مینار اور ہدایت کا منبع و سرچشمہ ہے' وہ بھی اسی بات کے دعوے دار ہیں' لیکن حال یہ ہے کہ آپس میں دست و گریباں ہیں' یہ ان کو کافر کہہ رہے ہیں اور وہ ان کی تکفیر کر رہے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اس تفرقہ بازی سے عوام (بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ) کا اعتماد دین پر سے' کتابِ الٰہی پر سے اور علماء پر سے اٹھتا چلا جاتا ہے۔

دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موقع پر دو جماعتیں موجود تھیں۔

ایک تو مشرکین کا گروہ ــــــ ان کے متعلق فرمایا گیا : ﴿ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ ﴾ اے نبیؐ! آپؐ کی دعوتِ توحید ان مشرکین پر بہت بھاری ہے۔ یہ اتنے دُور نکل گئے ہیں کہ ان کے لئے لوٹنا آسان نہیں ہے۔ ان میں سے اللہ ہی جس کو چاہے گا اس دعوتِ توحید کے لئے چن لے گا اور اپنے دین کی طرف کھینچ لے گا' اور جن کے دلوں میں تھوڑی سی بھی انابت ہے وہ جلد یا بدیر آپؐ کے جان نثاروں میں شامل ہو جائیں گے ــــــ رہا دوسرا گروہ جو اہل کتاب کا گروہ ہے' ان کے متعلق حضور ﷺ کو جو فکر لاحق ہو رہی تھی کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لا رہے تو اس کا ازالہ اس آیت میں فرما دیا گیا : ﴿ وَمَا تَفَرَّقُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ﴾ ــــــ یعنی اے نبیؐ! آپؐ تو پھر بھی ایک نئی کتاب لے کر آئے ہیں' آپؐ کی دعوتِ نبوت ان کے لئے نئی ہے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو یہ بھی مانتے ہیں اور وہ بھی' پھر بھی ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں ــــــ اور تو اور خود بھی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے ہیں۔ تو جو اتنے انانیت پرست ہیں کہ ایک کتاب کے ماننے کے باوجود متفرق ہیں وہ آپؐ کی بات کیسے تسلیم کر لیں گے؟ یہی بات علامہ اقبال نے "جوابِ شکوہ" میں ہمارے لئے کہی ہے۔ ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی' نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ' دین بھی' ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی' اللہ بھی' قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں!
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

ہماری فرقہ بندی کس سے پوشیدہ ہے۔ نہ معلوم کتنے فرقوں میں ہم بٹے ہوئے ہیں! اس کے نزدیک وہ کافر' اس کے نزدیک یہ کافر۔ اس کے سوا کوئی اور بحث سننے

میں نہیں آتی۔ الاماشاء اللہ!

لہٰذا حضور ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ اللہ آپؐ کے لئے راستہ نکالے گا' لیکن آپؐ ان یہود سے توقع نہ رکھئے کہ یہ تو کتابوں کو جاننے والے ہیں' توحید کو ماننے والے ہیں' ان کے یہاں بڑے بڑے علماء ہیں' لہٰذا یہ تو فوراً مان لیں گے۔ نہیں' ان کی انانیت ان کی راہ کا وہ پتھر ہے جو کسی طرح بھی انہیں آگے نہیں بڑھنے دے گا' بلکہ یہی آپؐ کی دشمنی میں سب سے آگے ہوں گے۔

اب ان حالات اور اس پس منظر میں آنحضور ﷺ کو کیا کرنا ہے؟ اس کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ قرآن مجید کی یہ بڑی عجیب آیت ہے۔ عجیب کے لفظ سے کہیں آپ کوئی اور مفہوم نہ لے لیں۔ عربی میں عجیب کے معنی ہیں بہت دلکش' بڑی پیاری' دل کو لبھانے والی بات۔ ہمارے ہاں عجیب و غریب کے مفہوم میں حیرت کا جو مفہوم پایا جاتا ہے اسے اپنے ذہن سے نکال دیجئے۔

سب سے دلکش ایمان

اس لفظ عجیب پر ایک حدیث ملاحظہ ہو۔ تصور کیجئے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ مسجد نبویؐ میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان جلوہ افروز ہیں ـــــ آپؐ صحابہؓ سے سوال فرماتے ہیں کہ "تمہارے نزدیک اَعجب (سب سے زیادہ عجیب) ایمان کس کا ہے؟" ـــــ یہ بھی حضور ﷺ کی تعلیم و تربیت کا ایک انداز ہے ـــــ! اَعجب 'عجیب' کا اسمِ تفضیل ہے۔ حضور ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت فرما رہے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ تمہارے خیال میں سب سے زیادہ پیارا' سب سے زیادہ دلکش ایمان کس کا ہے؟ صحابہؓ نے کہا: "فرشتوں کا"۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ)) "وہ کیسے ایمان نہ لائیں گے' وہ تو اپنے رب کے پاس ہیں!" یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ان کے لئے غیب میں ہوتے ہوئے بھی مشہود ہے۔ وہ ہر لمحہ اور ہر آن تجلیاتِ ربانی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ احکامِ الٰہی ان

کے پاس براہِ راست آتے ہیں' جن کی وہ تنفیذ کرتے ہیں۔ ان کی نگاہوں کے سامنے حقائق منکشف ہیں۔ وہ ایمان رکھتے ہیں تو کون سا کمال کرتے ہیں۔ اگر ابو جہل کے سامنے بھی جہنم لے آئی جائے تو وہ فوراً ایمان لے آئے گا۔ لہٰذا ان کے ایمان کے اَعجب ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا: فَالْاَنْبِيَاءُ "پھر نبیوں کا ایمان"۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ((وَمَالَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَالْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ)) "وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے جبکہ وحی ان پر نازل ہوتی ہے"۔ یعنی انبیاء پر اللہ کا فرشتہ وحی لے کر آتا ہے' انہیں غیب کی خبریں دیتا ہے' اللہ تعالیٰ اپنی نشانیوں میں سے کچھ نشانیوں کا ان کو مشاہدہ کراتا ہے' لہٰذا ان کا ایمان اَعجب کیسے ہوگا! تیسری بار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا: فَنَحْنُ "پھر ہم ہیں" ہمارا ایمان ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((وَمَالَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ)) "تم کیسے ایمان نہ لاتے جب کہ مَیں تمہارے مابین موجود ہوں"۔ اب نبی اکرم ﷺ نے خود جواب دیا ـــــــ اصل بات جو سمجھانا مقصود تھی وہ یہ کہ ((اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَيَّ اِيْمَانًا لَقَوْمٌ يَاْتُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ يَجِدُوْنَ صُحُفًا فِيْهِ كِتَابُ اللّٰهِ فَيُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِيْهَا)) "میرے نزدیک سب سے زیادہ دلکش ایمان والے وہ ہوں گے جو میرے بعد آئیں گے' ان کو تو اوراق ملیں گے جن میں اللہ کی کتاب درج ہوگی اور وہ اس پر ایمان لائیں گے"۔ یہ لوگ ہوں گے جن کا ایمان اَعجب یعنی سب سے دلکش ہوگا۔

اس مقام پر ایک اہم بات سمجھ لیجئے کہ یہاں افضلیت کی بات نہیں ہو رہی' دلکش ہونے کی بات ہے۔ افضل ایمان پوری امت میں سے یقیناً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کا ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابیؓ کا ایمان بھی بڑے سے بڑے ولی اللہ سے افضل ہے۔ یہاں میں نے سمجھانے کے لئے "ادنیٰ" کا لفظ استعمال کیا ہے' ورنہ کسی صحابی کے لئے ادنیٰ کا لفظ بھی مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ افضلیت بالکل جُدا بات ہے اور یہ شرف صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل ہے۔ ایمان کا پیارا ہونا' دلکش ہونا یہ بالکل دوسری بات ہے' اس کو confuse نہ کر لیجئے گا۔ صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان نبی اکرم ﷺ بنفس نفیس موجود تھے۔ آپ خود اپنی ذات میں ایک معجزہ ہیں، عظیم ترین معجزہ، لہٰذا ان کیلئے ایمان لانا آسان تھا ان کی بنسبت جو بعد میں آئے، جو نہ تو رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور نہ انہوں نے آنجناب ﷺ کے چہرۂ انور کا دیدار کیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرضِ منصبی: دعوت اور قیامِ عدل

اگلی آیت میں نبی اکرم ﷺ سے براہِ راست خطاب ہے۔ طویل آیت ہے اور اس میں نہایت اہم مضامین جامعیت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ آیت کا آغاز ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ سے :

﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ﴾ "پس (اے محمد ﷺ) آپ اسی کی دعوت دیتے رہئے۔"

آیت کے اس حصے کو سمجھنے کے لئے توحید کی دو شاخیں ذہن میں رکھئے۔ پہلی توحید علمی یا نظری یا توحید فی المعرفۃ یا توحید فی العقیدۃ ــــ دوسری توحید عملی ــــ پھر اس توحید عملی کی بھی دو شاخیں ہیں ــــ ایک توحید انفرادی و ذاتی' دوسری توحید اجتماعی۔

ذاتی و انفرادی توحید یہ ہے کہ اللہ ہی کی بندگی اور پرستش کی جائے' اپنی اطاعت کو اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ جیسے فرمایا گیا : ﴿ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ○ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ﴾ "پس اللہ کو پکارو اس کے لئے دین (اپنی بندگی) کو خالص کرتے ہوئے۔ آگاہ رہو! دین خالص اللہ کا حق ہے!" آپ نے انفرادی سطح پر یہ کر لیا تو آپ کی ذات کی حد تک عملی توحید نافذ ہو گئی۔ اب عملی توحید کی دوسری منزل یہ ہے کہ اجتماعی نظام پر بھی اس کو قائم اور نافذ کرو۔ پورا نظامِ زندگی اس کا مظہر بن جائے کہ ﴿ لِيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ﴾ ــــ یہ ہوگی توحید اجتماعی' یہی اقامت دین ہے۔ اسی کا حکم سورۃ الشوریٰ کی آیت ﴿ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ﴾ میں آیا ہے۔

توحید عملی کی انفرادیت سے اجتماعیت تک پیش رفت کے مابین نقطۂ ماسکہ (link) کیا ہے؟ وہ ہے دعوت ــــ ایک فرد نے ذاتی طور پر توحید اختیار کی تو فطری تقاضا یہ ہوگا کہ وہ اس کی طرف دوسروں کو بلائے' دوسروں کو اس کی دعوت دے' ان کو بھی توحید کی طرف راغب کرے' انہیں بھی اللہ کی بندگی کی طرف پکارے۔

پھر جو اس دعوت پر لبیک کہیں ان کو وہ مجتمع کرے' ان کو منظم کرے' ان کی تربیت کرے۔ یہاں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے تین مراحل کا ذکر آگیا۔[1] پھر اس کے لئے لازم ہو گا کہ وہ ان تین مراحل سے گزر کر ایک طاقت فراہم کرے اور نظامِ باطل کو تلپٹ کر کے رکھ دے' اسے بیخ و بن سے اکھیڑ کر دین اللہ کو قائم کر دے' تاکہ اجتماعی توحید کی تکمیل ہو جائے۔ اب انفرادی توحید اور اجتماعی توحید کے درمیان نقطۂ ماسکہ دعوت ہے۔ سورۂ حٰم السجدۃ کی آیت ۳۳ کو ذہن میں رکھئے۔ فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ ﴾ اور یہاں فرمایا: ﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ﴾ یہاں کلمہ "ف" اور "لامِ غایت" نے ذٰلک سے مل کر اس آیت کو ماسبق آیات سے بھی مربوط کر دیا ہے اور اس پس منظر سے بھی جو اس پوری سورۂ شوریٰ کے نزول کے وقت موجود تھا' جس کا ذکر پہلے ہو چکا۔ اس دعوت کا ہدف ہو گا اقامت دین۔ ﴿ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ﴾ ـــــ اے نبیؐ! اسی کی دعوت دیجئے کہ اللہ کے دین کو قائم کرو' نافذ کرو' برپا کرو' مجتمع و منظم ہو جاؤ' باطل سے ٹکراؤ اور اس تصادم کے لئے خود کو قربانی اور ایثار کے لئے تیار کرو۔ یہ ہوئی ﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ﴾ کی تشریح و توضیح۔

استقامت کا حکم

آگے فرمایا: ﴿ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ﴾ "اور ڈٹے رہئے (جمے رہئے)' جس کا آپ کو حکم ہوا ہے!" یعنی ﴿ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ﴾ اور ﴿ قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ○ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ ﴾

[1] دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے انقلابی پہلو اور ان کے جملہ مراحل کی تفہیم کے لئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے اس درسِ قرآن اور خطاب کا مطالعہ ان شاء اللہ نہایت مفید رہے گا جو "مسلمانوں کے فرائض دینی اور اسوۂ رسول ﷺ" کے نام سے کتابی شکل میں موجود ہے۔ (مرتب)

پھر حکم ہوا : ﴿ قُلِ اللّٰہَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّہٗ دِیْنِیْ ﴾ کہہ دیجئے اے محمد (ﷺ)! مجھے تو یہ حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے مَیں اس کے فرمان کے سامنے سر جھکاؤں۔ سب سے پہلے مَیں اس کا فرماں بردار بنوں۔ اور کہہ دیجئے کہ مَیں تو اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے اسی کی عبادت کرتا ہوں اور کروں گا ـــــ یہاں انشائیہ اسلوب میں آپؐ سے فرمایا جا رہا ہے : ﴿ وَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ ﴾ "پس آپؐ ڈٹے رہئے (مستقیم رہئے) اس پر جو آپؐ کو حکم ہوا ہے۔" ـــــ یعنی مخالفت تو ہے' دباؤ پڑ رہا ہے' اس میں کوئی شک نہیں' آپؐ کے لئے مصائب کے بڑے بڑے طوفان آتے نظر آتے ہیں' یہ سب صحیح ہے' لیکن آپؐ نے کھڑے رہنا ہے اور جمے رہنا ہے۔

مکّی دَور کی سورتوں میں آپ کو نظر آئے گا کہ اس استقامت کیلئے آنحضور ﷺ کو بار بار صبر کی تلقین و وصیت کی جا رہی ہے۔ اور آنجنابؐ کے توسط سے یہ تلقین اہلِ ایمان کو بھی ہو رہی ہے۔ سورۃ المدثر میں فرمایا گیا : ﴿ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ﴾ "(اے محمدؐ!) اپنے ربّ کے راستے کی دعوت میں پیش آنے والی مشکلات پر صبر کیجئے۔" سورۃ الاحقاف میں فرمایا گیا : ﴿ فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ "صبر کیجئے (اے محمد ﷺ!) جیسے ہمارے اولوا العزم پیغمبر صبر کرتے آئے ہیں۔" سورۃ النحل میں فرمایا گیا : ﴿ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰہِ ﴾ "(اے محمدؐ!) صبر کیجئے! اور آپ کا سہارا بس اللہ ہی ہے"۔ یعنی صبر کے لئے بھی کوئی سہارا درکار ہے تو آپؐ کا سہارا ہم خود ہیں' آپؐ کے صبر کی بنیاد ہم سے تعلق اور محبت ہے۔ سورۃ القلم میں فرمایا گیا : ﴿ فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّكَ وَلَا تَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ ﴾ "پس (اے محمدؐ!) صبر کیجئے' اپنے ربّ کے حکم کا انتظار کیجئے اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو جایئے گا"۔ یہاں صاحب الحوت سے مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے ذرا جلدی کی تھی' عجلت کا مظاہرہ کیا تھا' اس کے علاوہ اور کچھ نہیں' معاذ اللہ کسی گناہ کا کوئی سوال نہیں۔ کسی نبی سے کسی گناہ کا صدور نہیں ہو سکتا۔ ہوا یہ تھا کہ دین کی حمیت و غیرت اتنی غالب آگئی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کئے بغیر اپنی قوم سے ان

کے کفر پر اڑے رہنے کے باعث متنفر اور مایوس ہو کر اس قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہاں یہ فرمایا گیا کہ ایسا نہ کیجئے گا! سورۃ المزمل میں فرمایا گیا : ﴿وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا﴾ "(اے نبیؐ!) صبر کیجئے اس پر جو کچھ یہ مشرکین کہہ رہے ہیں اور ان سے بہتر اور احسن طریق سے کنارہ کشی اختیار کیجئے"۔ نقل کفر' کفر نہ باشد' دعوتِ توحید پیش کرنے کے نتیجے میں مشرکین میں سے کوئی آپؐ کو پاگل کہہ رہا ہے' کوئی کہہ رہا ہے کہ دماغ خراب ہو گیا ہے' کوئی شاعر کہہ رہا ہے' کوئی ساحر کہہ رہا ہے اور کوئی کہہ رہا ہے کہ ساحر بھی نہیں بلکہ مسحور ہیں' ان پر کسی نے جادو کر رکھا ہے' یہ اس جادو کے زیرِ اثر ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ بھی نہیں ہے' آسیب زدہ ہیں' ان پر کوئی جن آ گیا ہے' یہ مجنون ہیں۔ یہ ساری باتیں سن رہے ہیں جناب محمد ﷺ' اور حکم ہو رہا ہے کہ صبر کیجئے اس پر کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں! : ﴿وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ﴾ پھر آنحضور ﷺ کو تسلی اور تشفی بھی دی جا رہی ہے۔ سورۃ القلم میں فرمایا گیا : ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ○ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ○ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ○ وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ○﴾ "ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں' آپؐ اپنے ربّ کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ اور یقیناً آپؐ کے لئے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے اور (اے نبیؐ!) تحقیق آپؐ اخلاق کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہیں" ـــــ لہٰذا ان مشرکین کی باتوں کا اثر نہ لیجئے!

یہ ہے سارا پس منظر جس میں حضور ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے : ﴿وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ﴾ ـــــ دباؤ کتنا ہی سخت ہو' مخالفت کتنی ہی شدید ہو' استہزاء اور تمسخر کتنا ہی دل آزار اور اذیت ناک ہو' حالات کتنے ہی ناموافق و ناسازگار ہوں' ماحول کتنا ہی ناسازگار ہو' اے نبیؐ! آپؐ کو عبادتِ ربّ' دعوت الی اللہ اور اقامتِ دین کی جدّ و جُہد اور سعی و جہاد کا جو حکم ہوا ہے' اس پر جمے رہیے' ڈٹے رہیے۔ سورۂ حٰم السجدۃ کی آیت ۳۰ میں استقامت کا ذکر آ چکا ہے۔ فرمایا : ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا

تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝ ﴾اس لفظ استقامت میں ایک قیامت مضمر ہے۔ کہو کہ ہمارا رب اللہ ہے' اور اس پر چٹان کی مانند جم جاؤ۔ اب کوئی طوفان کتنا ہی سخت اور شدید آئے تمہارے قدموں میں جنبش اور لغزش پیدا نہ کرسکے۔ لہٰذا قولی اور عملی ہر نوع کی مخالفت کو اے محمدؐ! آپ جھیلئے۔ ﴿وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ﴾ کا یہی مطلب ہے۔

مصالحانہ رویّہ کی ممانعت

اس آیت کے اگلے حصہ میں فرمایا :

﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ﴾

"اور (اے نبیؐ!) ان (مشرکوں اور کافروں) کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے۔"

قریش کے مشرک سرداروں نے جب یہ محسوس کیا کہ اس دعوتِ توحید کو روکنے میں ہر نوع کے استہزاء و تمسخر اور شدید جور و ستم کے باوجود ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہو رہیں اور وہ نہ تو نبی اکرم ﷺ کو دعوتِ توحید سے روک سکے ہیں' نہ ان کے مظالم سعید لوگوں کو یہ دعوت قبول کرنے سے باز رکھ سکے ہیں اور نہ ہی دعوت قبول کرنے والے کسی شخص کو مصائب سے ہراساں کر کے دین چھوڑنے پر آمادہ کر سکے ہیں تو مشرکین کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کے پاس سفارتیں اور پیشکشیں آنی شروع ہو گئیں اور آپؐ کے سامنے مصالحت کا یہ فارمولا پیش کیا جانے لگا کہ کچھ ہم آپؐ کی بات مان لیتے ہیں کچھ آپؐ ہماری بات مان لیں۔ سورۃ القلم میں آغاز ہی میں یہ فرما دیا گیا تھا کہ : ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ۝ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ۝﴾ "پس (اے نبیؐ!) آپؐ ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آئیں! یہ تو چاہتے ہیں کہ آپؐ کچھ ڈھیلے پڑیں' کچھ مداہنت کریں تو یہ بھی ڈھیلے پڑیں اور مداہنت کا رویہ اختیار کر لیں۔" انہوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ آپؐ کے قدموں میں ذرا سی بھی لغزش نہیں آئی اور یہ پورا زور لگا کر بھی آپؐ کو پیچھے ہٹانے

میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اب یہ چاہتے ہیں کہ مصالحت ہو جائے' کچھ مان لیجئے کچھ منوا لیجئے' give and take کا معاملہ کر لیجئے' کچھ دیجئے کچھ لیجئے' ہماری بھی کچھ عزت رہ جائے۔ ساری کی ساری بات آپ کی مان لی جائے یہ ممکن نہیں ہے۔ آپؐ کو پیش کش کی گئی کہ اگر اس دعوتِ توحید کے ذریعے آپ کو دولت درکار ہے تو اشارہ کر دیجئے ہم دولت کے انبار آپؐ کے قدموں میں لگا دیں گے' اگر آپ اقتدار چاہتے ہوں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنانے کے لئے تیار ہیں' اگر آپؐ کسی خاص خاتون سے نکاح کرنے کی خواہش رکھتے ہوں تو اشارہ کر دیجئے وہاں نکاح ہو جائے گا۔

یہ ہوتا ہے دامِ ہم رنگِ زمین۔ اللہ کی طرف بلانے والا اللہ کا بندہ شدید مشکلات اور مصائب میں گھرا ہوا ہے۔ حالات اتنے نامساعد اور ناموافق ہیں کہ بظاہر کہیں راستہ نکلتا نظر نہیں آ رہا۔ ان حالات کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے جس سے اس وقت آنحضور ﷺ اور اہل ایمان دوچار ہیں۔ اس وقت ایسی ایسی پیشکشیں آتی ہیں تو نفس تو کہتا ہے کہ قبول کر لو' چلو اس وقت یہ سو فیصد نہیں مانتے' پچاس فی صد ماننے کے لئے تیار ہیں' اسی کو غنیمت سمجھ کر مصالحت کر لی جائے' رفتہ رفتہ ان کو رام کر لیا جائے گا اور پورے دین پر عمل پیرا ہونے کے لئے ان کو آمادہ کر لیا جائے گا۔ لیکن حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ نہیں' ڈٹے رہیۓ' دین کل کا کل قبول کریں تو ٹھیک ہے۔ جزوی دین' دین ہے ہی نہیں۔ اسی لئے یہاں فرمایا گیا : ﴿ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ ﴾ ان ہی احکامِ الٰہی کے پیشِ نظر مشرکین کی دامِ ہم رنگِ زمین پیش کشوں اور قتل کرنے کی دھمکیوں کے جواب میں نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے جو تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جائیں تو بھی اس جواب کی شان کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ نے مشرکین کو جواب دیا :

"اگر تم میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دو تب بھی میں اس دعوت سے باز نہیں آ سکتا۔ یا تو میں اس دعوت کی تبلیغ میں اپنی جان دے دوں گا یا اللہ اس کو کامیابی سے ہمکنار فرمائے گا۔"

یہ تھی اس حکم کی عملی اور قولی تعمیل کہ ﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ﴾

علامہ اقبال نے اس بات کو بڑی خوبصورتی سے اس شعر میں ادا کیا ہے ؂

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

یہی صورتِ حال مدینہ منورہ میں بھی پیش آ گئی تھی۔ وہاں بھی یہود کے علماء کا مطالبہ یہی تھا کہ کچھ لیجئے کچھ دیجئے' کچھ ہماری باتیں مانئے کچھ ہم آپ کی باتیں مان لیں گے۔ اسی پس منظر میں سورۃ البقرۃ میں' جو مدنی سورت ہے' فرمایا گیا : ﴿ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ﴾ "(اے نبیؐ!) یہ یہود و نصاریٰ آپؐ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک آپؐ ان کی ملت (طور طریقوں) کا اتباع نہ کریں"۔ یہ تو اپنے تعصب اور اپنی عصبیت کی وجہ سے اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ یہ آپؐ سے کبھی راضی نہ ہوں گے۔ آپؐ اگر انہیں کچھ رعایتیں دینے پر آمادہ ہو جائیں تب بھی یہ آپؐ سے کبھی راضی نہ ہوں گے۔ اصل مسئلہ تو ہے دینی قیادت کا۔ آپؐ ان کے پیچھے چلیں تب یہ خوش ہوں گے۔ یہ اہلِ کتاب اچھی طرح جانتے تھے کہ آپؐ بحیثیتِ رسول دین کے معاملہ میں کسی مصالحت کے لئے تیار ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے ان کی مصالحانہ پیش کش بھی اخلاص و خلوص پر مبنی نہیں ہوتی تھی' بلکہ اس لئے ہوتی تھی کہ اپنے عوام اور حلقۂ اثر کو یہ مغالطہ دیں کہ ہم تو مصالحت کی برابر کوشش اور پیشکش کر رہے ہیں' لیکن محمد (ﷺ) ہی اپنے موقف پر بضد ہیں۔ قرآن حکیم نے ان اہل کتاب کے نفاق کو مختلف اسالیب سے فاش کیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ طویل آیتوں میں سے ایک ہے۔ اس میں پہلے تو ان اہل کتاب کے ان جرائم کا ذکر کیا گیا ہے جو وہ اپنی کتاب اور اپنی شریعت کی خلاف ورزیوں کے طور پر کرتے تھے۔ جو کام خود ان کی شریعت میں حرام تھے ان کا ارتکاب کرتے تھے' پھر بھی اس بات کے دعوے دار تھے کہ ہم شریعت موسوی پر کاربند ہیں' اس پر کامل ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے چند جرائم گنوا کر فرمایا گیا:

﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝ ﴾

"تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دُنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں۔ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔"

آیت کا یہ حصہ یہود کے اس طرزِ عمل کی مکمل عکاسی کرتا ہے جو انہوں نے اللہ کی شریعت کو حصوں میں تقسیم کر کے اختیار کیا ہوا تھا۔ وہ اس جرم کا ارتکاب کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے کچھ حصوں پر عمل کرتے تھے اور کچھ حصوں کو چھوڑ دیتے تھے' یا ان کے بالکل خلاف عمل کرتے تھے۔ گویا ان کی اطاعت اخلاص و خلوص سے خالی تھی۔ اس میں ملاوٹ شامل ہو گئی تھی۔ اس میں نفس کی چاہت اور خواہشات کی پیروی کی آمیزش ہو گئی تھی۔ اس طرزِ عمل میں آیت کے اس حصے میں جو سخت وعید آئی ہے وہ لرزا دینے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دین و شریعت کے ساتھ جو بھی یہ معاملہ کرے گا کہ ایک طرف اللہ کی توحید' اس کی کتاب اور اس کے رسول(ﷺ) پر ایمان لانے کا دعویٰ ہو' دوسری طرف اس کے دین اور اس کی شریعت کے ساتھ یہ معاملہ ہو کہ کچھ حصے پر عمل ہو اور کچھ حصے کو چھوڑ دیا جائے یا اس کے برخلاف عمل کیا جائے' تو اس امت کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ وہی معاملہ کرے گا جو سابقہ امت کے ساتھ کیا گیا ہے: ﴿ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا۝ ﴾ (فاطر: ۴۳) آج ہم بحیثیت امت دُنیا میں ذلیل و خوار ہیں' ہمارا کوئی وقار نہیں' ہماری کوئی وقعت نہیں۔ یہ نقد سزا ہے جو ہم کو دُنیا میں مل رہی ہے اس جرم کی کہ ہم نے بھی یہود کی طرح دین و شریعت کو اجزاء میں تقسیم کر رکھا ہے۔ مسجدوں میں تو اللہ کا حکم چلے

اور عدالتوں میں' اسمبلیوں میں' معاشیات میں' معاشرت میں' ملک کے مجموعی اور اجتماعی نظام میں اللہ کے احکام بے دخل رہیں۔

ان چند جملہ ہائے معترضہ کے بعد اصل مضمون کی طرف آیئے۔ نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ ﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ﴾ اور منع فرمایا جا رہا ہے کہ ان منکرینِ حق کی خواہشات کی ہرگز پیروی نہ کیجئے گا۔ دراصل اس اسلوب میں ان کفار اور مشرکین کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ تم رسول اللہ ﷺ سے یہ توقعات نہ رکھو کہ وہ تمہاری خواہشات کی پیروی کریں گے۔ یہ سب مفاہیم و معانی آیت کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں سموئے ہوئے ہیں کہ : ﴿ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ ﴾

ایمان بالکتب

قرآن مجید کا یہ اعجاز دیکھئے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں نہایت جامعیت کے ساتھ نہایت اہم مضامین و موضوعات کا احاطہ کر لیتا ہے۔ کوزے میں سمندر بند کرنے کا محاورہ اگر صدفی صد راست آتا ہے تو وہ قرآن مجید کی ہر آیت پر راست آتا ہے۔ اب اسی آیت کا اگلا حصہ پڑھئے اور دیکھئے کہ ایک بات ڈنکے کی چوٹ کہنے کا نبی اکرم ﷺ کو حکم ہو رہا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ ﴾

"اور (اے نبیؐ!) کہہ دیجئے کہ میں تو ایمان رکھتا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے۔"

یہاں توقف کر کے پہلے "مِنْ كِتَابٍ" کی کچھ شرح سمجھ لیجئے۔ یہاں "مِنْ كِتَابٍ" فرما کر یہ بات واضح کی گئی ہے کہ نبی اکرم ﷺ صرف قرآن کریم ہی کو منزل من اللہ تسلیم نہیں فرماتے تھے' بلکہ ہر آسمانی کتاب کو ماننے کا اقرار فرماتے تھے' از روئے الفاظ قرآنی ﴿ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ اسی بات کو سورۃ البقرۃ کے آخری رکوع میں اس طرح واضح فرمایا گیا ہے : ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۚ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ

وَ رُسُلِہٖ ﴾ "ہمارے یہ رسول (محمد ﷺ) اس ہدایت یعنی قرآن پر ایمان لائے ہیں جو ان کے ربّ کی جانب سے ان پر نازل کی گئی ہے اور وہ بھی ایمان رکھتے ہیں جنہوں نے ہمارے رسولؐ کی تصدیق کی ہے۔ یہ سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی طرف سے نازل کردہ تمام کتابوں پر اور اس کی طرف سے مبعوث کئے جانے والے تمام رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں" ــــــــ اور ہمارے رسولؐ اور ان کے اصحاب کا قول یہ ہے : ﴿ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ ﴾ "ہم اللہ کے رسولوں کے مابین تفریق نہیں کرتے۔" مطلب یہ ہوا کہ تورات' زبور' انجیل اور دوسرے صحیفے جو بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ان سب پر بھی اور قرآن پر بھی ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ قرآن مجید درحقیقت تمام آسمانی کتابوں کا مہیمن و مصدق ہے۔ پہلی کتابیں مُحَرَّف ہو گئیں' صحیفے گم ہو گئے۔ قرآن ان سب کا جامع ہے اور تاقیامِ قیامت محفوظ رہے گا۔ اسی طرح حضور ﷺ خاتم النبیین والمرسلین ہیں اور اللہ کے تمام رسولوں کی تصدیق خاتم النبیین والمرسلین بھی اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم بھی کرتے ہیں۔

آیت ۱۴ میں لفظ کتاب آچکا ہے : ﴿ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِھِمْ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مُرِیْبٍ ○ ﴾ بظاہر یہ کتاب کے ماننے والے ہیں' بظاہر یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا ایمان تورات پر ہے' لیکن ان کا یقین متزلزل ہو چکا ہے۔ اپنے دینی سربراہوں کا کردار دیکھ کر' ان کے رویہ کو دیکھ کر' ان کے تفرقے کو دیکھ کر ان کتابوں پر سے ان کا اعتماد اٹھ چکا ہے' ان کا ایمان ہل چکا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہاں نبی اکرم ﷺ کی زبان سے کہلوایا جا رہا ہے: ﴿ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ ۚ ﴾ میرا ایمان تو اس کتاب پر ہے جو اللہ نے نازل فرمائی ہے' اور میرا سارا عمل اس کے مطابق ہے' میں تو اس پر جما ہوا ہوں۔

قرآن میں تبدیلی کا مطالبہ

سورۂ یونس میں مشرکین کے اس مطالبہ کا حوالہ آیا ہے جو وہ قرآن میں تغیرو

تبدّل کے لئے کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر یہ ہو جائے تو ہماری اور آپ کی صلح ہو سکتی ہے۔ سورۂ یونس میں فرمایا :

﴿ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ ﴾ (آیت ۱۵)

"اور جب انہیں ہماری روشن اور بیّن آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو آخرت میں ہم سے ملنے کا یقین نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اس میں ردوبدل کردو"۔

ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ قرآن بہت rigid ہے' یہ بالکل بے لچک ہے' اس کا موقف بہت سخت ہے' آخر دوسروں کو بھی accomodate کیا جانا چاہئے' مصالحانہ رویّہ (compromising attitude) بھی تو ہونا چاہئے' لہٰذا کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا پھر اسی میں تغیر و تبدل کرو' کچھ اس کی سختی کم کرو اور اسے نرم بناؤ۔ جواب کیا دلوایا گیا :

﴿ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴾ (آیت ۱۵)

"(اے نبی!) کہہ دیجئے کہ میرے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ میں اپنے جی سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کروں۔ میں تو خود اسی کے اتباع پر مامور ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے ہولناک عذاب کا خوف ہے۔"

یعنی اگر یہ باتیں مَیں اپنے جی سے کہہ رہا ہوتا' یہ میرے اپنے نظریات ہوتے' میرا اپنا کوئی پروگرام ہوتا' کوئی پارٹی منشور ہوتا جس کو چند لوگوں کی مشاورت سے بنایا گیا ہوتا تو مَیں اس میں ترمیم و تنسیخ کر سکتا تھا' کوئی ردّوبدل ہو سکتا تھا' لیکن یہ اللہ کا کلام ہے' اس کے فرامین ہیں جو میں تمہیں پڑھ کر سنا رہا ہوں۔ ـــــ ﴿ وَاُمِرْتُ

لِاَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ ﴾ مجھے تو حکم ملا ہے کہ اللہ کا پہلا فرماں بردار میں خود بنوں۔ چنانچہ اللہ کے احکام کے سامنے سر جھکانے والا اور اس کی فرماں برداری کرنے والا سب سے پہلے میں خود ہوں۔ لہٰذا میرے لئے یہ کہاں ممکن ہے کہ قرآن مجید میں کوئی تبدیلی کر سکوں۔ معاذ اللہ ' ثم معاذ اللہ ـــــ یہی تو بات تھی کہ سورۃ الزمر کے آخر میں کس قدر جلالی انداز ہے کہ : ﴿ قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّیْٓ اَعْبُدُ اَیُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ○ ﴾ "(اے نبی!) کہہ دیجئے کہ جاہلو! کیا تم مجھے بھی یہ حکم اور مشورہ دے رہے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی اور پرستش شروع کر دوں"۔ اے حرص و ہوا کے بندو! مجھے اپنے اوپر قیاس نہ کرو' مجھے مصلحتوں کے راستے نہ دکھاؤ۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ اللہ کی بندگی کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کروں۔ مجھے تو حکم ملا ہے : ﴿ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ ○ ﴾ کہ میں اللہ ہی کی بندگی اور پرستش کرتا رہوں اور اس کے شکر گزار بندوں میں شامل رہوں۔ وہی حکم یہاں ہے کہ : ﴿ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ ﴾

نظامِ عدل و قسط کا قیام

اب آگے اس آیت کریمہ کا نہایت اہم حصّہ آرہا ہے۔ سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۵ طویل آیات میں سے ایک ہے اور اس آیت کے ہر حصّہ میں معانی و مفاہیم کے سمندر پنہاں ہیں۔ اب اگلے حصّہ پر توجہات کو مرتکز کیجئے۔ فرمایا :

﴿ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ۚ ﴾

"اور مجھے حکم ملا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں۔"

یہ حصّہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی صحیح تفسیر و تعبیر یہ ہے کہ "دین اللہ" درحقیقت اجتماعی نظامِ عدل و قسط ہے۔ دین اللہ قائم کرنے کا مقصد کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ انسانوں کے مابین عدل و قسط اور انصاف کا نظام قائم ہو۔ تمدن کی جو بھی پیچیدگیاں اور اونچ نیچ ہے' ان سب کو رفع کر کے ایک مبنی بر انصاف نظام قائم ہو۔

معاشرے کے کسی فرد کے بھی حقوق تلف نہ ہوں۔ معاشرے کا کوئی طبقہ کسی دوسرے طبقہ کا استحصال نہ کر سکے۔ عورت اور مرد کے درمیان مبنی بر انصاف توازن ہو۔ سرمایہ اور محنت کے درمیان مبنی بر قسط و عدل توازن ہو۔ فرد اور معاشرے کے درمیان توازن ہو اور یہ توازن بھی عدل و قسط پر مبنی ہو۔ ان تمام اعتبارات سے عدل و قسط قائم کرنا ہی شریعت کا منشاء و مدّعا ہے۔ اس بات کو مزید سمجھنے کے لئے سورۃ الحدید کی پچیسویں آیت دیکھئے' جس کے آغاز میں فرمایا :

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ ﴾

"بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو بینات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل و قسط پر قائم ہو جائیں۔"

یہ قرآن حکیم کی بڑی مہتم بالشان آیتوں میں سے ایک ہے۔ اس میں رسولوں کی بعثت اور ان کو معجزات اور واضح و روشن دلائل دیئے جانے کا مقصد بھی بیان ہوا ہے اور کتب نیز ساتھ ہی میزان یعنی شریعت کے نزول کی غایت بھی واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے۔ ان تمام کی غرض وغایت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ بنی نوعِ انسان عدل و قسط پر قائم ہوں ﴿ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ ﴾ ایک ایسا اجتماعی نظامِ حیات نافذ اور جاری و ساری ہو جو مبنی بر عدل و قسط اور انصاف ہو۔ جس پر کاربند ہو کر کوئی کسی کا خون نہ چوسے' کوئی کسی کا استحصال نہ کرے' کوئی کسی کو ناجائز طور پر دبائے نہیں' کوئی کسی پر ظلم نہ کرے' کوئی کسی کی حق تلفی نہ کرے۔ کوئی کسی پر جور و ستم اور دست درازی نہ کرے۔ لہٰذا صرف دین اللہ اور المیزان یعنی شریعتِ الٰہی کے ذریعے انسان کو وہ معیارِ حق و باطل مل سکتا ہے جو ٹھیک ٹھیک تول کر بتا دے کہ انسانی معاشرے میں حقوق و فرائض کا توازن کیا ہے! نظریات و افکار میں حق کیا ہے اور باطل کیا ہے! اخلاق و معاشرت میں طہارت و پاکیزگی کے معیارات کیا ہیں! یہی نظام متعین کرتا ہے کہ عبد و معبود کے درمیان صحیح تعلق کی اساسات کیا ہیں! اس حیاتِ

دنیوی کا آخرت کی ابدی زندگی سے ربط و تعلق کیا ہے؟

اظہارِ دین الحق

نبی اکرم ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب میں بنفس نفیس بالفعل دین اللہ قائم، غالب اور نافذ کر کے دکھا دیا۔ خلافت راشدہ میں اسی نظامِ عدل و قسط کے مزید خد و خال نمایاں ہوئے۔ اسی لئے اسے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا جاتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر جب بیعت خلافت ہوئی تو آپؓ نے جو پہلا خطبہ دیا یعنی Policy Statement کا اعلان کیا تو اس میں اسی عدل و قسط کے نظام کی وضاحت میں فرمایا کہ "اے لوگو! میرے نزدیک تم میں سے ہر قوی کمزور رہو گا جب تک کہ میں اس سے حق وصول نہ کرلوں اور ہر کمزور میرے نزدیک قوی ہو گا جب تک کہ اس کا حق اسے دلوا نہ دوں" —— پھر یاد کیجئے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر کیا ارشاد فرمایا تھا جب اسلام کے نظامِ عدل و قسط کا جھنڈا عرب و عجم اور شمالی افریقہ کے وسیع علاقوں پر لہرانے لگا تھا اور اللہ کا کلمہ ہی سب سے بلند ہو گیا تھا کہ "عمر کو یہ اندیشہ مضطرب اور بے چین کیے رکھتا ہے کہ اگر دجلہ یا فرات کے کنارے کوئی کتا بھوک سے ہلاک ہو گیا تو آخرت میں مجھ سے اس کی باز پرس ہو گی" —— جس نظامِ عدل و قسط میں اس کا سربراہ بھوک سے ایک کُتے کے ہلاک ہو جانے پر خوفزدہ اور ہراساں رہتا ہو، اندازہ لگا لیجئے کہ انسان کے حقوق کی عدل و انصاف کے ساتھ پاسداری اور ادائیگی کا اس نظام میں کیا مقام ہو گا!!

یہاں ایک اور بات نوٹ کر لیجئے کہ قرآن حکیم کا یہ اسلوب ہے کہ اس میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور بیان ہوتے ہیں۔ سورۂ حدید میں تو تمام رسولوں کے ساتھ کتابوں اور میزان کے نازل فرمانے کی غایت اور اس کا مقصد بیان فرمایا گیا کہ ﴿ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾۔ اسی سورۂ شوریٰ کی سترہویں آیت میں نبی اکرم ﷺ پر کتاب یعنی قرآن اور میزانِ شریعت کے نزول کا ذکر موجود ہے: ﴿ اَللّٰهُ

الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ؕ ﴾[1]

پس یہ دین اللہ' یہ شریعت' یہ میزان درحقیقت نظامِ عدل و قسط ہے۔ یہ عادلانہ و منصفانہ اجتماعی نظام ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو عطا فرماتا رہا اور جس کا اِکمال واِتمام ہوا نبی اکرم ﷺ پر۔ از روئے الفاظِ قرآنی :

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ ﴾ (المائدۃ : ۳)

"آج (یعنی نبی اکرم ﷺ کے توسط سے آپؐ کے زمانہ بعثت میں) مَیں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام بطورِ دین (نظامِ حیات) قبول کر لیا ہے۔"

کسی واعظ اور رسول کی دعوت کا فرق

یہاں پر ﴿ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ﴾ کے ضمن میں ایک بات سمجھنے کی ہے کہ ایک ہوتا ہے واعظ۔ اس کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ وعظ کہا اور اگلی منزل کی طرف چل دیا۔ اگر کوئی پیشہ ور واعظ ہے تو اس کا اصل مقصود و مطلوب یہ ہوتا ہے کہ اس کے وعظ کی دھوم ہو' اس کے زورِ خطابت کی سامعین داد دیں' جہاں جائے لوگ نعروں سے استقبال کریں' وہاں گلے میں ہار پڑیں' عمدہ سے عمدہ کھانا ملے' بطور نذرانہ خدمت ہو جائے۔ پھر اگلی منزل ہے۔ وہاں بھی وعظ کہا' مطلوب حاصل کیا' پھر اگلی منزل ہے ـــــ لیکن ایک وہ شخص ہے جو کھڑا ہو جاتا ہے اور منادی کرتا ہے

---

[1] سورۂ شوریٰ کی آیت زیرِ درس میں تو حضور ﷺ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ ﴿ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ﴾ سورۂ نساء کی آیت ۵۸ میں تمام اہل ایمان سے فرمایا گیا : ﴿ وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ ﴾ "(اے مسلمانو!) جب بھی تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو"۔ اسی طرح سورۂ نحل کی آیت ۹۰ کے آغاز میں نہایت تاکیدی اسلوب سے فرمایا گیا: ﴿ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ... ﴾ "(اے مسلمانو!) اللہ تمہیں عدل اور بھلائی کرنے کا حکم دیتا ہے..." (مرتب)

کہ میں صرف وعظ کہنے نہیں آیا' نظامِ عدل و قسط قائم کرنے آیا ہوں ﴿ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ﴾ ـــــ اب تو زمین و آسمان کا فرق واقع ہو گیا۔ ناجائز طور سے کمائی کرنے والے اور حرام خوری کرنے والے لوگ اپنی حرام اور ناجائز طریقے سے کمائی ہوئی دولت میں سے کسی واعظ کو نذرانے کے طور پر کچھ دے دیں' خوب مرغن کھانا کھلا دیں' ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ نظام تو وہی رہے گا' نظام پر کوئی آنچ تک نہیں آنے پائے گی اور یہی تو وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ظالمانہ نظام' ہمارے تشدّد' ہمارے استحصال' ہمارے دباؤ' ہمارے مشرکانہ یا مبتدعانہ عقائد' ہمارے جاہلیت پر مبنی رسم و رواج اور ہماری حرام خوریوں پر آنچ نہیں آنی چاہئے ـــــ ان پر نکیر نہ ہو' ان کو چیلنج نہ کیا جائے۔ نذرانے لے لو' چڑھاوے چڑھوا لو' کوئی اور خدمت ہے تو بتاؤ' حاضر ہیں۔ چندے لینے ہیں' حاضر ہیں۔ مگر ہمارے نظام کو مت چھیڑنا۔

لیکن جہاں بات یہ آ جائے کہ ﴿ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ﴾ میں صرف وعظ کہنے نہیں آیا ہوں' میں نظامِ عدل و قسط قائم کرنے آیا ہوں' مَیں مامور مِنَ اللہ ہوں' مجھے تو اس کا حکم ملا ہے' تو ظاہر ہے کہ جو لوگوں کا طرح طرح سے خون چوس رہے ہیں وہ تو مخالفت کریں گے۔ جن کے مفادات پر زد پڑتی ہو' آنچ آتی ہو وہ کسی طور اس کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ایک غلط اور ظالمانہ نظام کا جو ناجائز انتفاع ہے اور جو Vested Interest ہے وہ ختم ہو جائے۔ یہ بات ان کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں ہو گی اور وہ اس سے کبھی بھی دست بردار ہونے کے لئے آمادہ نہیں ہوں گے۔ ایسا نہیں ہو گا کہ وہ آپ کو موقع دے دیں' walk over دے دیں کہ چلئے آپ نظامِ عدل و قسط قائم کر دیں۔ وہ تو مزاحمت کریں گے' مخالفت کریں گے' اس دعوت کو کچلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔ عدل قائم کرنے کا کیا مطلب ہے؟ یہی کہ جن لوگوں کو ناجائز مراعات حاصل ہیں وہ ان سے چھین لی جائیں۔ لہٰذا اب تصادم ہو گا' اب لڑائی ہو گی' اب مقابلہ ہو گا' اب حزب اللہ اور حزب الشیطان آمنے سامنے آئیں گے۔ اب مقاتلہ طے کرے گا کہ کون اپنے موقف میں سچا اور

مخلص تھا، کون اس کے لئے کتنی قربانیاں دینے کے لئے تیار تھا! اب تو فیصلہ اس طور پر ہو گا۔

پس یہ چیزیں بڑی مختلف ہیں۔ ایک وعظ کی بات ہے، عقیدے کی دعوت ہے، اس کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ جیسے عیسائی مشنریز ہیں کہ نظام سے ان کو کوئی غرض نہیں، کوئی تعرض نہیں، اس پر کوئی تنقید و نکیر نہیں، تمہارا جو نظام ہے رکھو، ملوکیت ہے تو رہے، ہمیں اس سے کیا لینا ہے، کوئی قوم دوسری قوم پر مستبدانہ طور پر مسلط ہے تو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، ہمیں تو اپنے عقیدے کو پھیلانا ہے۔ وہ بھی اکثر و بیشتر خیراتی اور رفاہی کاموں کے ذریعے سے پھیلایا جاتا ہے کہ معاشرے کے گرے پڑے طبقات میں کہیں دودھ اور گھی کے ڈبے بانٹ دیئے، کہیں بسکٹ اور اسی نوع کی دوسری چیزیں تقسیم کر دیں۔ کہیں ان کے علاج و معالجہ کے لئے ہسپتال قائم کر دیئے۔ کہیں ان کی تعلیم کے لئے مشنریز اسکول اور کالج کا انتظام کر دیا اور ان طور طریقوں سے ان کے ذہنوں میں اپنا عقیدہ داخل کر دیا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلّا۔ ان کے پاس نہ کوئی نظام ہے نہ شریعت، محض عقیدہ ہے یا چند رسوم (rituals)۔ ان کا کام اس پر ختم ہو جاتا ہے کہ پہلے کسی کا نام عنایت اللہ یا کرشن چندر تھا تو ان کے نام عنایت مسیح اور کرشن مسیح میں تبدیل کرا دیئے اور مردم شماری میں ان کا نام و مذہب بدلوا کر ان لوگوں کو مطمئن کر دیا جو اوپر بیٹھے اس کام کے لئے اربوں ڈالر سے بھی زیادہ رقوم کے سالانہ بجٹ فراہم کرتے ہیں۔ تو یہ تبلیغ انقلابی تبلیغ نہیں ہے۔ انقلابی تبلیغ تو وہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمائی۔ آنحضور ﷺ نے ڈنکے کی چوٹ اعلان فرمایا ﴿ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ﴾ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں"۔ میں تمہارے مابین عدل قائم کرنے آیا ہوں۔ میں مامور من اللہ ہوں۔ میری بعثت کا تکمیلی مقصد یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین اور میزان (شریعت) قائم کروں، اللہ کا نازل کردہ وہ نظامِ عدل و قسط بالفعل قائم کر دوں کہ جس سے حق دار کو اس کا مکمل حق مل جائے، حق بحق دار رسید!! کوئی شخص

اور کوئی طبقہ کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کر سکے‘ کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے۔ وہ نظام جو ظالم کا ہاتھ پکڑ لے اور مظلوم کی دادرسی کرے‘ وہ نظام جو عدوان‘ جور و ظلم اور استحصال سے پاک و صاف نظام ہو ــــــ میں محض واعظ بن کر نہیں آیا ہوں۔

آیت کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا انقلابی پہلو کوزے میں سمندر کی مانند سمویا ہوا ہے۔ سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا یہ انقلابی پہلو عموماً لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں ہے‘ حالانکہ آنحضور ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان ہی اللہ کی کبریائی اور اس کی حاکمیت پر مبنی نظامِ عدل و قسط کا قیام اور اس کا غلبہ ہے۔ بالکل آغاز ہی میں آنحضور ﷺ اس منصب پر فائز فرمائے گئے تھے۔ سورۃ المدثر کی ابتدائی تین آیات ذہن میں لایئے جو اکثر مفسرین کے نزدیک تیسری وحی ہے: ﴿ یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ ﴾ یہی بات سورۃ الفتح‘ سورۃ التوبہ اور سورۃ الصف میں بایں الفاظ فرمائی گئی: ﴿ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ﴾

دُنیا میں جو بھی نظام ہائے اطاعت رائج ہیں ان سب پر اللہ کے دین کو غالب کرنا آنحضور ﷺ کا فرضِ منصبی ہے۔ اپنی حیاتِ طیبہ میں آپؐ نے بنفسِ نفیس جزیرہ نمائے عرب میں بالفعل یہ نظام قائم کر کے اور چلا کے دکھایا۔ اسی انقلابی نظریہ اور دین کو خلافتِ راشدہ میں اس وقت کی معلوم و مہذب دُنیا کے بڑے حصے پر غالب کر دیا گیا ــــــ اسی بات کو نبی اکرم ﷺ سے آیت زیرِ مطالعہ کے اس حصہ میں کہلوایا گیا ہے: ﴿ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ﴾

حُجّت بازی سے کنارہ کشی کا اصل الاصول

حضور ﷺ سے فرمایا گیا کہ ﴿ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ﴾ یعنی مشرکین کی شدید ترین مزاحمت اور اہلِ کتاب کی بدترین مخالفت کے باوجود آپؐ اللہ تبارک و تعالیٰ کی عبادت پر مبنی اقامتِ دین کی دعوت دیتے رہیے۔ ان معاندین کی طرف سے جو تشدد

اور تعدّی ہو رہی ہے اس پر صبر کیجئے اور اپنے موقف پر مستقیم رہئے' جمے رہئے۔ ان کی خواہشات کی قطعاً پروا نہ کیجئے اور ان سے کہہ دیجئے کہ میں تو اس کتاب پر ایمان رکھتا ہوں جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور کہہ دیجئے کہ ﴿ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ﴾ اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل قائم کروں۔

اسی سلسلۂ کلام میں آگے فرمایا :

﴿ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾

"(اے نبی کہہ دیجئے) اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ ہمارے درمیان کوئی حجت بازی اور کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ہم سب کو ایک روز جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔"

یہ بات کس سے کہی جا رہی ہے! مشرکین سے بھی اور خاص طور پر اہلِ کتاب سے جن کا ذکر ما قبل آیت میں آ چکا ہے ــــــ لہٰذا قریب تر وہی ہیں۔ ویسے بھی توحید کا وہ اقرار کرنے والے' نبوت و رسالت سے وہ واقف' نبیّ آخر الزّماں ﷺ کے ظہور و بعثت کے وہ منتظر۔ پھر بھی وہ مخالفت میں پیش پیش۔ اسی لئے ان سے خطاب کر کے سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا :

﴿ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ﴾

"اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو ہم نے (محمد ﷺ پر) نازل کی ہے اور جو اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود ہے۔ لہٰذا تمہارے لئے یہ بات ہرگز مناسب نہیں (بلکہ جائز نہیں) کہ تم ہی سب سے پہلے اس کا انکار کرنے والے بنو۔"

تمہارے پاس تورات ہے' جو هُدًى وَّنُوْرٌ ہے۔ اس کے باوجود تم ہمارے رسولؐ کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے ہو' مشرکینِ مکہ کی پیٹھ ٹھونک رہے ہو' ان کو حجت

کے لئے مواد فراہم کر رہے ہو' ان کو ہمارے نبی ﷺ سے طرح طرح کے سوالات کرنے اور الجھنے کی ترکیبیں سکھا رہے ہو ____ سن رکھو کہ اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ معقول دلائل سے حق تم پر واضح ہو چکا ہے۔ اب ہمارے اعمال کا نتیجہ ہمیں ملے گا اور اپنے اعمال کا نتیجہ تم بھگتو گے ____ ہمارے مابین کسی حجت بازی اور کج بحثی کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم توحید پر کاربند ہو اور دین ہی کے لئے کام کر رہے ہو تو اللہ عالم الغیب ہے' وہ فیصلہ فرما دے گا۔ اگر خلوص سے ہم توحید پر عمل پیرا ہیں اور اس کے دین توحید کو ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے قائم کرنے کی جِدّوجُہد کر رہے ہیں تو ہم اللہ سے اجر پا لیں گے ____ ہم تمہارے اعمال کا اجر نہیں لے سکتے اور تم ہمارے اعمال کا اجر نہیں پا سکتے۔ ہر شخص اپنے اپنے اعمال کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ہاں مسئول و ماجور ہو گا۔ از روئے الفاظِ قرآنی :

﴿ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝ ﴾ (المُدَّثر : ۳۸)

"ہر ذی نفس اپنی کمائی کے عوض اللہ کے ہاں رہن ہے۔"

جو نیکی یا بدی وہ کمائے گا اسی کے مطابق اسے بدلہ مل کر رہے گا ____ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بالحق تخلیق فرمایا ہے تاکہ آخرت میں ہر متنفس کو اس کی اس دُنیا میں کمائی کا پورا بدلہ دیا جائے۔ وہاں لوگوں پر ہرگز ظلم نہیں کیا جائے گا۔ کسی کی حق تلفی نہیں ہو گی۔

ہمارے لئے عظیم رہنمائی

امت کی تاریخ پر چودہ صدیوں کا زمانہ بیت گیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ امت میں مختلف فرقے موجود ہیں۔ لوگ اس بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں بہتّر (۷۲) فرقوں کا ذکر آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہاں بہتّر کی تعداد کثرت کے لئے آئی ہے' ورنہ اتنے فرقے موجود نہیں رہے۔ مشہور فرقے تو سُنّی'

شیعہ' خارجی اور معتزلہ رہے ہیں۔ ان میں بھی سُنّی اور شیعہ اصل فرقے ہیں جن کے مابین قریباً ساڑھے چودہ سو برس سے مسلسل کشمکش چلی آرہی ہے' کیونکہ ان کے مابین نہایت بنیادی' اصولی اور اساسی (fundamental) اختلافات ہیں۔ مثلاً خلافت کا تصور اور امامت کا تصور ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ سُنّی مکتبِ فکر کے نزدیک معصومیت خاصۂ نبوت ہے' نبی کے علاوہ کوئی معصوم نہیں' نبوت ختم ہوئی تو معصومیت بھی ختم ہوئی' جبکہ شیعہ مکتب فکر میں امام کی معصومیت جزوِ ایمان ہے۔ پھر ان کے ہاں امامت صرف آلِ فاطمہ رضی اللہ عنہا میں منحصر ہے اور ان کے لئے مختص ہے ___ ان کے ہاں البتہ کئی فرقے ہیں جن میں وہ بھی ہیں جو امام غائب کے قائل اور ان کے ظہور کے منتظر ہیں اور وہ بھی ہیں جن کا امام مسلسل چلا آرہا ہے اور ہر دور میں حاضر و موجود رہتا ہے۔ ان میں حلول کے قائل بھی موجود ہیں۔ بہرحال اہلِ تشیّع میں بے شمار فرقے ماضی میں بھی رہے ہیں اور اب بھی موجود ہیں ___ باقی رہا اہل سنّت والجماعت کا معاملہ تو یہ غلط فہمی دُور کر لیجئے کہ حنفی' مالکی' شافعی' حنبلی اور اہل حدیث حضرات کے مابین کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ یہ حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ چند فقہی امور و مسائل کی تفصیلات کی تعبیر' توضیح' تشریح' تفسیر' ترجمانی (interpretation) اور انطباق و استنباط (implication) میں تھوڑا تھوڑا اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ یہ تو ہماری بدقسمتی ہے کہ چند پیشہ ور واعظوں اور چند علمائے سُوء نے اپنی مسندیں' اپنی قیادتیں' اپنی چودھراہٹیں اور اپنی سیادتیں قائم رکھنے اور چمکانے کے لئے چند فروعی مسائل کو' جن کی دین میں گنجائش موجود ہے' نزاعی مسائل بنا کر مورچہ بندی کر رکھی ہے اور اپنی انانیت کے تحت امت کی وحدت کو پارہ پارہ کر رکھا ہے۔

اس وقت اس بحث کا موقع نہیں' بلکہ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ خلوص و اخلاص اور نیک نیتی سے دین کا کام کرنے والوں میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے' رائے کا بھی اور طریقۂ کار کا بھی۔ یہ اختلاف بھی مبنی بر اخلاص ہو سکتا ہے۔ اس کو ایک سادہ سی

مثال سے سمجھئے کہ یہ ایک عملی مسئلہ ہے۔ ایک ایسے پرانے مریض کا تصور کیجئے جو کسی ایک مرض میں نہیں بلکہ بہت سی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ اس کی حالت متعدد امراض کی وجہ سے ناگفتہ بہ ہے ـــــ اس کے دل میں بھی ضعف ہے' اس کا جگر بھی خراب ہے۔ اس کے گردے بھی ماؤف ہو رہے ہیں۔ نزلے اور زکام میں بھی وہ مبتلا ہے۔ اب اگر آپ اس مریض کے علاج و معالجہ کے لئے چار حکیم یا ڈاکٹر لا کر کھڑے کر دیں گے تو ان کے مابین اختلاف رائے ممکن ہے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ حکیم اور ڈاکٹر کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا مریض اس کے علاج سے شفا پائے اور صحت یاب ہو جائے۔ وہ مریض کے لئے چاہتا ہے یا اپنی نیک نامی' شہرت اور منفعت کے لئے چاہتا ہے' اس کو چھوڑیئے' بہرحال وہ مریض کی شفا ضرور چاہے گا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ پورے خلوص و اخلاص اور نیک نیتی کے باوجود ان چاروں کی تشخیص اور تجویز میں بھی فرق ہو۔ ایک کی تشخیص یہ ہو کہ اس کے جگر کی فکر کرو' اصل اہمیت جگر کی ہے۔ دوسرے کا خیال ہو کہ اہمیت گردوں کی ہے' ان کی فکر کرو۔ کہیں گردوں نے کام چھوڑ دیا تو مریض ہاتھ سے گیا۔ تیسرے کی رائے ہو کہ اس وقت اصل توجہ پھیپھڑوں پر دی جانی چاہئے اور پہلے نزلہ و زکام کی فکر کرنی چاہئے۔ چوتھے کا اصرار ہو کہ دل کا معاملہ اوّلین اہمیت رکھتا ہے' اس کی پہلے فکر لازم ہے۔ چاروں معالج مخلص ہیں اور دل سے مریض کی شفا کے متمنی ہیں' لیکن تشخیص و تجویز میں اقدمیت و اوّلیت اور اہمیت کے معاملہ میں اختلاف کر رہے ہیں۔

اس مثال میں اب مریض کی جگہ اُمّتِ مُسلمہ کو رکھ لیجئے۔ کوئی مخلص و دیانتدار اور دردمند اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ شیطان کے ہتھکنڈوں' اغیار کی ریشہ دوانیوں اور دوست نما دشمنوں کی سازشوں کے باعث امت صدیوں سے بیمار ہوتے ہوتے فی الوقت اعتقادی' فکری و نظری اور عملی و اخلاقی اعتبارات سے بے شمار بیماریوں اور خرابیوں میں مبتلا ہے۔ اللہ کے دین کا جھنڈا بتمام و کمال کہیں بھی سربلند نہیں ہے۔ جو دین فاران کی چوٹیوں سے آفتابِ عالم تاب کی طرح طلوع ہوا

تھا‘ جس نے نورِ توحید سے کرۂ ارضی کے ایک بڑے حصّے کو منور کر دیا تھا‘ آج اس دین پر غربت و مسکنت طاری ہے۔ کفر و الحاد‘ شرک و زندقہ اور بدعات و خرافات کے اندھیاروں میں یہ آفتابِ ہدایت گہنا دیا گیا ہے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ چند لوگوں کے دلوں میں اپنے دین اور اپنے رسول ﷺ کی امت کا درد پیدا فرماتا ہے۔ وہ لوگ غور و فکر کرتے ہیں کہ تجدید و احیاءِ دین اور اصلاحِ اُمّت کے کام کا آغاز کس طور سے کیا جائے‘ کس کام کو اقدمیت و اوّلیت دی جائے۔ جس رائے پر ان کا دل ٹھک جاتا ہے‘ انہیں انشراحِ صدر حاصل ہو جاتا ہے اس کے مطابق کام کے لئے وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ تمام معاملہ اجتہادی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وحی کا سلسلہ تو منقطع ہو چکا۔ نبوت تو جناب محمد ﷺ پر ختم ہو چکی۔ لہٰذا جو درد مند شخص احیاءِ دین اور اصلاحِ امت کے لئے اٹھتا ہے وہ اجتہادی طور پر کوشش کرتا ہے کہ بہتر سے بہتر طریق پر دین کی تجدید کا‘ اسلام کی سربلندی کا‘ اقامتِ دین کا اور اُمّت کی اعتقادی و عملی خرابیوں کی اصلاح کا کام کروں۔ اس کی تشخیص و تجویز سے پورے اخلاص و خلوص اور نیک نیّت کے باوجود بھی اختلاف ممکن ہے۔

اس بات کو سامنے رکھئے اور آیت کے آخری حصّے کو پڑھئے اور یہ نتیجہ اخذ کیجئے کہ ایسے اشخاص اور ایسی جماعتوں کو باہم دست و گریباں نہیں ہونا چاہئے۔ اپنے اپنے طریقوں پر دین کی خدمت اور احیاءِ اسلام کے لئے خلوص و اخلاص کے ساتھ عمل پیرا رہیں لیکن ایک دوسرے پر الزام تراشی نہ کریں‘ ایک دوسرے کی ٹانگیں نہ گھسیٹیں‘ اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جذبات پروان نہ چڑھائیں‘ بلکہ جہاں تک ہو سکے تعاون و اشتراک کا معاملہ رکھیں۔ ایک دوسرے کے خیر خواہ رہیں اور انداز وہ اختیار کریں جس کی طرف ہمیں آیت مبارکہ کے ان الفاظ میں رہنمائی مل رہی ہے کہ ﴿ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ﴾ ”اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔“ ﴿ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ﴾ ”ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال“۔ ﴿ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ﴾ ”ہمارے اور

تمہارے مابین حجت (بحث و تمحیص اور مناظرہ) کی کوئی ضرورت نہیں"۔ ﴿ اَللّٰہُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا ﴾ اگر ہم مخلص ہیں اور اخلاص کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور تم بھی مخلص ہو اور خلوص سے کام کر رہے ہو تو "اللہ ایک دن ہمیں جمع کر دے گا"۔ منزل اگر ایک ہے تو لازماً سب ایک دن ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔

۹ ذی الحجہ کو منیٰ سے لاکھوں انسان چلتے ہیں' سب کو عرفات جانا ہے' وقوفِ عرفہ کرنا ہے' وہی اصل حج ہے۔ عرفات جانے کے لئے ہزاروں قافلے بنے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا جھنڈا علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے اور اونچا رکھا جاتا ہے تاکہ اس قافلے کا کوئی آدمی کہیں ادھر ادھر ہو جائے تو اپنے جھنڈے کو دیکھ کر قریب آ جائے ورنہ بچھڑ جائے گا اور دوبارہ ملنا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا لوگ قافلوں کی شکل میں چلتے ہیں' لیکن منزل سب کی ایک ہے۔ جن لوگوں کو حال ہی میں حج کی سعادت نصیب ہوئی ہو وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اب تو منیٰ سے عرفات کے لئے چھ بڑی کشادہ سڑکیں ہیں' لیکن یہ سب سڑکیں قافلوں کو آخر کار عرفات پہنچائیں گی۔ سب قافلے وہاں جمع ہو جائیں گے۔ پس دین کی خدمت یا اقامتِ دین کی جدّوجہد میں جو لوگ اور جو جماعتیں بھی خلوص و اخلاص کے ساتھ مصروف رہی ہیں اور ان کے طریقہ کار میں اختلاف ہے ان کے لئے فکرمندی کی کوئی بات نہیں۔ اگر منزل ایک ہے تو قریب سے قریب تر ہوتے چلے جائیں گے اور آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں منزل پر پہنچ کر سب ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔ چلئے اگر دُنیا میں ہم قریب نہ بھی ہوئے تو ایک دن آنا ہے جب اپنے ربّ کے حضور میں حاضری ہوگی : ﴿ اَللّٰہُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ ﴾ آخر لوٹنا تو وہیں ہے۔ وہاں جا کر پتہ چل جائے گا کہ کون کتنے پانی میں تھا۔ وہاں پر حقیقت کھل جائے گی کہ کس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹیاں بندھ گئی تھیں' کون جماعتی عصبیتِ جاہلیہ میں گرفتار ہو گیا تھا اور کون خلوص کے ساتھ چل رہا تھا! کون کس شخصیت کی عقیدت کا غلام ہو گیا تھا! ہر ایک کی حقیقت کھل جائے گی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا ہو جائے گا۔ کون مخلص تھا اور کون غیر مخلص'

وہاں سب عیاں ہو جائے گا۔ جو مخلصین ہوں گے وہ باہم شیر و شکر ہو جائیں گے۔

اہلِ ایمان کے تذکرے میں سورۃ الحجر میں الفاظ آئے ہیں : ﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ○ ﴾ "اور ان کے دلوں میں اگر ایک دوسرے کی طرف سے میل ہوا تو ہم اسے نکال دیں گے اور وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے"۔ جب ان سے کہا جائے گا کہ جنت میں سلامتی کے ساتھ بے خوف و خطر داخل ہو جاؤ ﴿ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴾ تو اہلِ ایمان کے دلوں میں برہنائے طبع بشری اپنے کسی بھائی کے بارے میں اگر کوئی رنجش اور میل موجود ہو گا تو جنت میں اللہ اس کو دلوں سے نکال دے گا۔ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت میرے اور معاویہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے رضی اللہ عنہما۔ ایک دوسرے کی طرف سے دلوں میں میل تو آیا تھا۔ جب تلواریں نیاموں سے باہر آگئی تھیں تو یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ دونوں کے دل ایک دوسرے سے آئینہ کی طرح صاف تھے۔ شکوہ' شکایت اور گلہ ایک دوسرے سے پیدا ہوا۔ اسی لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کہہ رہے ہیں کہ جنتی ہم دونوں ہیں۔ رنجش کی وجہ سے اس دُنیا میں ہمارے دلوں میں جو میل آ گیا ہے' جو کدورت پیدا ہو گئی ہے' تو اللہ تعالیٰ جنت میں اس رنجش کو صاف کر دے گا۔

دُنیا میں خلوص و اخلاص کے ساتھ دین کے لئے کام کرتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے گلے اور شکوے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر حضرت علی اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کے مابین رنجش پیدا ہوئی' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں' تو ہم کیسے یہ دعویٰ کریں گے کہ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے کبھی کوئی میل آتا ہی نہیں' کوئی رنجش کبھی پیدا ہوتی ہی نہیں۔ لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ تصور ذہن میں رکھا جائے کہ : ﴿ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ○ ﴾ پس اگر ہم جمع نہ بھی ہوئے تو کوئی حرج نہیں' ہمارا کام تو جمع ہو جائے گا۔ آپ بھی دین کے

لئے محنت کر رہے ہیں اور میں بھی دین ہی کے لئے محنت کر رہا ہوں تو ان محنتوں کے ثمرات کہاں جمع (credit) ہوں گے؟ ظاہر بات ہے کہ دین کے کھاتے میں۔ فرض کیجئے کوئی ایک شخص کسی ایک جماعت کے ذریعے سے دین کے قریب آجاتا ہے اور کوئی دوسرا شخص کسی دوسری جماعت کے ذریعے سے دین کے قریب آیا ہے تو کام تو جمع ہو ہی گئے' چاہے وہ قافلے جمع نہ ہوئے ہوں۔

حاصلِ گفتگو

شروع میں ذکر ہو چکا ہے کہ اقامتِ دین کے موضوع پر یہ تین آیات اہم ترین ہیں۔ اس کے مخاطبین' اس کے مخالفین' مخالفت کی وجوہ' تفرقہ کا سبب' ان سب کا علاج' پھر جو داعی ہو اس کا کردار' اس کو کن باتوں کو ملحوظ رکھنا ہے' ان تین آیات میں یہ تمام مضامین آگئے ہیں' بس غور و فکر اور تدبر سے انہیں ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔

مخالفین و معاندین کے لئے انتباہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ . . . ﴾

"کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں ابھی بحث و مباحثہ اور حجت بازی میں پڑے ہوئے ہیں' حالانکہ اللہ کی پکار پر لبیک کہی جا چکی ہے"۔

یہاں "فِي اللّٰهِ" سے مراد "فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ" ہے۔ یعنی ابھی تک جو لوگ اللہ کے دین کے بارے میں جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

آگے بڑھنے سے قبل آیت کے اس حصہ کو وضاحت سے سمجھ لیجئے۔ دیکھئے جب کوئی نئی دعوت اٹھتی ہے تو کچھ لوگ اتنے ذہین ہوتے ہیں کہ وہ اس کو اس کی face value پر قبول کر لیتے ہیں اور ان میں اتنی جرأت بھی ہوتی ہے کہ ع ہرچہ بادا باد' ماکشتی در آب انداختیم۔ اب جو ہو سو ہو ہم نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔

اب تیریں گے تو اس کے ساتھ اور ڈوبیں گے تو اس کے ساتھ۔ لیکن سب لوگوں میں اتنی ہمت نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں کہ جن کو حقیقت تو معلوم ہو جاتی ہے کہ بات صحیح ہے' لیکن منجدھار میں چھلانگ لگانے کے لئے جو ہمت درکار ہوتی ہے اس کا ان میں فقدان ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے ایک جنگل ہے' اس میں جانے کا کوئی راستہ ہونا تو درکنار پگڈنڈی بھی بنی ہوئی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں کوئی بڑی ہمت والا ہی ہو گا جو اس میں داخل ہو گا۔ لیکن اگر کچھ لوگوں نے چل کر پگڈنڈی بنا دی ہو تو نسبتاً کم ہمت لوگ بھی اس پر چل پڑنے کا اپنے اندر حوصلہ پیدا کر لیں گے' کیونکہ ان کو نظر آ رہا ہے کہ راستہ بنا ہوا ہے اور کچھ لوگ اس پر چل کر جنگل میں داخل ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ یہی بات یہاں کہی جا رہی ہے کہ ﴿ وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ ﴾ اللہ کے دین کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد بھی بعض لوگ دعوت قبول کرنے والوں سے حجت بازی کر رہے ہیں۔

سورۃ الشوریٰ کے نزول کا زمانہ مکی دَور کا آخری تیسرا حصہ یعنی سن آٹھ نبوی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس وقت تک بہت سے ایسے لوگ بھی ایمان لا چکے تھے جو قریش میں ایک باحیثیت مقام رکھتے تھے اور ایسے بھی جو دبے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ گویا کہ بہت سے لوگوں نے بیچ منجدھار کود کر دکھا دیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے تشدد جھیل کر' مصائب برداشت کر کے اور قربانیاں دے کر اعلیٰ مثالیں قائم کر دی تھیں۔ اس طرح ان لوگوں کے لئے جو کم ہمت تھے' راستہ بن گیا اور اب ان کے لئے اس پر چلنا آسان ہو گیا۔ جو اَب بھی تاخیر و تعویق میں ہوں' لیت و لعل میں ہوں' جو اَب بھی حجت بازی میں پڑے ہوں' معلوم ہوا کہ اب ان کا کوئی عذر اللہ تعالیٰ کی جناب میں لائق پذیرائی نہیں رہا۔ ﴿ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ ان کی حجت' ان کی دلیل ان کے ربّ کے پاس بالکل باطل اور پادر ہوا ہے۔ ﴿ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۝ ﴾ "اور ان پر اللہ کا شدید غضب نازل ہو کر رہے گا

اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے"۔

قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ اس آیت میں ان کم ہمت لوگوں کے لئے بھی انتباہ ہے جو دعوت کو حق سمجھ لینے کے باوجود مشرکین و مخالفین کے تشدّد اور تعدّی کے خوف سے دعوت کو قبول کرنے میں ہچکچا رہے ہیں اور ان کے لئے بھی شدید وعید ہے کہ جن کے دل دعوت کی حقانیت تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ اپنے مفادات' اپنے تعصبات اور اپنی عصبیت کے باعث دعوت کو قبول کرنے کے بجائے اس کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور اس دعوت کو کچلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور ان کا ساتھ دے رہے ہیں جو صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ گویا وہ سرے سے دعوت کی حقانیت کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اس آیت میں تینوں قسم کے لوگ مخاطبین ہیں۔

الکتاب والمیزان = قرآن و سُنّت

اگلی آیت میں وہ مضمون آ رہا ہے جو ﴿ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ﴾ کی توضیح و تشریح کے ضمن میں سورۃ الحدید کی ایک آیت کے حوالے سے بیان ہو چکا ہے۔ سورۃ الشوریٰ مکی سورتوں میں اتنی ہی اہمیت کی حامل ہے جتنی مدنی سورتوں میں سورۃ الحدید۔ سورۃ الحدید میں رسولوں کی بعثت' ان کو بینات عطا کرنے' ان کے ساتھ کتابیں اور میزان یعنی شریعت نازل فرمانے کی غرض و غایت ان الفاظِ مبارکہ میں بیان فرمائی گئی تھی کہ : ﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ ﴾ جبکہ یہاں فرمایا :

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ ﴾

"اللہ ہی ہے وہ ذات جس نے حق کے ساتھ کتاب اتاری اور میزان بھی اتاری"۔

جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کتاب تورات نازل ہوئی تو اس کے ساتھ شریعتِ موسوی اتری' ویسے ہی جناب محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوا تو اس کے ساتھ ہی

المیزان یعنی شریعتِ محمدی یا دین الحق نازل ہوا۔ یہی بات اس آیتِ مبارکہ کی ابتداء میں ایک دوسرے اسلوب سے فرمائی جو سورۃ التوبہ، سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف میں بایں الفاظ وارد ہوئی : ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ ﴾ "وہ (اللہ) ہی ہے جس نے اپنے رسول (ﷺ) کو بھیجا الہدیٰ اور دین الحق کے ساتھ"۔ یہاں "و" واوِ عطف ہے۔ دین الحق الہدیٰ سے مختلف اور علیحدہ چیز ہے، اس معنی میں کہ الہدیٰ یعنی قرآن مجید میں علمی اور اصولی ہدایت ہے جبکہ سُنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس کی عملی تفسیر اور اس کا عملی مظاہرہ (demonstration) ہے۔ جب قرآن حکیم کے ساتھ سُنّتِ رسولؐ جمع ہو جائے گی تو دین الحق بنے گا اور وہ میزان یعنی شریعت سامنے آئے گی کہ کس کا کیا حق ہے اور کس کے کیا فرائض ہیں، کیا واجبات ہیں۔ اور طے ہو گا کہ (What is due to him and what is due from him) اس پر لازم کیا ہے اور اس کا حق کیا ہے ــــــ یہ ہے کتاب اور میزان جو اللہ نے نازل فرمائی۔

غور طلب بات

اب غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے میزان کس لئے نازل فرمائی! ایسے ہی رکھی رہے یا اس میں ماپا اور تولا جائے! میزان تو اس لئے اتاری گئی کہ نصب ہو۔ دین اس لئے دیا گیا کہ قائم ہو۔ دین اگر قائم نہ ہو تو وہ دین ہے ہی نہیں، پھر تو وہ مذہب بن گیا۔ وہ صرف ایک عقیدہ اور ایک cult بن کر رہ گیا۔ وہ محض چند رسوم (rituals) کا مجموعہ بن گیا۔ دین تو وہ ہے جو ایک نظام کی حیثیت سے بالفعل قائم و نافذ ہو۔ اس کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھ لیجئے، انگریز کے دورِ غلامی میں جس نظام کی حکومت تھی وہ "دینِ انگریز" تھا۔ تاجِ برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے مطاعِ مطلق برطانوی پارلیمنٹ تھی۔ تمام فوجداری اور دیوانی قوانین اس کے بنائے ہوئے تھے اور ان

کے مطابق ہی ملک کا نظام چل رہا تھا۔ البتہ دوسرے مذاہب کے ساتھ مسلمانوں کو بھی یہ آزادی حاصل تھی کہ نجی زندگی میں نمازیں پڑھ لو' روزے رکھ لو' حج کو چلے جاؤ' اپنے طور پر زکوٰۃ ادا کر دو' شادی بیاہ کی رسوم اپنے طور پر بجالاؤ۔ پرائیویٹ اور شخصی معاملات میں انگریز سرکار کو کوئی سروکار نہیں' البتہ ملک کا نظام اور قانون (law of the land) انگریز کا بنایا ہوا رائج و نافذ رہے گا۔ اس صورت حال کے پیش نظر ہی علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا۔

مُلاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اب پھر اس آیت پر توجہ مرتکز کیجئے۔ فرمایا :

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ؕ ﴾ "وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ اتاری ہے کتاب بھی اور میزان بھی"۔ سورۃ الحدید میں بعثتِ رُسل' انزالِ کتب و میزان کی جو غرض و غایت بیان فرمائی گئی تھی کہ ﴿ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ ﴾ "تاکہ لوگ عدل وقسط پر قائم ہو جائیں"۔ اس کو آیت کے اس حصے کے ساتھ ذہن و قلب پر ثبت کر لیجئے تو ﴿ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ ﴾ اور ﴿ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ﴾ کے جملہ مقتضیات و متضمنات واضح ہو کر سامنے آجائیں گے۔

انجام سے متعلق تنبیہہ

اسی آیت کے دوسرے حصہ میں فرمایا :

﴿ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝ ﴾

"اور (اے نبی ﷺ!) آپ کو کیا معلوم کہ قیامت قریب ہو اور سر پر آئی کھڑی ہو"۔

یہاں انداز مختلف ہے۔ اس میں انسانوں کو ایک فطری اور نفسیاتی کمزوری پر متنبہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ حقیقت کو انہوں نے پہچان بھی لیا لیکن دل کے اندر جو چور ہے اور مفادات و لذّاتِ دُنیوی سے جو اُنس ہے اس کی وجہ سے تاخیر و تعویق کا معاملہ ہوتا ہے۔ سوچ کا انداز یہ ہو جاتا ہے کہ بات تو حق ہے' قبول کرنی چاہئے اور

ہم ضرور قبول کریں گے' ذرا فلاں فلاں کاموں سے فارغ ہو جائیں تو پھر ہم بھی میدان میں کود پڑیں گے۔ بس یہ ذمہ داریاں ہیں ان سے نمٹ لیں' ذرا بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں ان سے عہدہ برآ ہو جائیں تو پھر اقامتِ دین کی جدوجُہد میں ہمہ وقت اور ہمہ تن لگ جائیں گے اور اپنی ساری توانائیاں اور اپنے تمام اوقات اللہ کی راہ میں لگادیں گے۔ اس سے بڑا فریب اور دھوکہ کوئی نہیں۔ اور دھوکہ کس کو دے رہے ہیں؟ حقیقی بات یہ ہے کہ اس سے بڑی خود فریبی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ ع کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد۔ اپنی بچیوں سے فارغ ہوں گے تو آگے نواسیاں اور پوتیاں ہوں گی۔ اپنی ذمہ داریوں سے فراغت کیسے ہو گی۔ نسل تو آگے پھیلے گی' بڑھے گی اور نہ معلوم کیا کیا معاشرتی پیچیدگیوں (problems) سے سابقہ پیش آئے گا۔ اوّل تو فراغت ملتی نہیں۔ لیکن فرض کیجئے کہ کسی نے سوچ رکھا ہو کہ ریٹائر ہو جاؤں پھر دین کے لئے کام کروں گا تو حکومت بھی اس وقت ریٹائر کرتی ہے جب صلاحیت و اہلیت برائے نام رہ جاتی ہے۔ ایسی حالت و کیفیت میں آپ دین کے لئے کریں گے کیا؟ اس لئے کہ حکومت نے ریٹائرمنٹ کی مدت خوب سوچ سمجھ کر رکھی ہے۔ توانائیاں تو خدمتِ سرکار میں ختم ہوئیں' اب تو آپ کی حیثیت Spent up Force کی ہے۔ یہ ہیں وہ دھوکے اور فریب جو انسان کا نفس خود اسے دیتا ہے۔ سورۃ الحدید میں یہ مضمون اہلِ ایمان کے لئے مختص ہو کر آیا ہے۔ وہاں فرمایا : ﴿ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ﴾ "کیا وقت آ نہیں گیا ہے اہل ایمان کے لئے کہ جھک جائیں ان کے دل اللہ کی یاد میں اور اس حق کے سامنے جو نازل ہو گیا ہے۔" یہ تاخیر اور تعویق' اور یہ بات کہ یہ کرلوں وہ کرلوں پھر دین کے کام میں لگ جاؤں گا ـــــــ خود فریبی کے اس چکر سے کب نکلو گے؟ وہی بات نبی اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر بطورِ واقعہ اور حقیقت فرمائی جا رہی ہے : ﴿ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِیْبٌ ۝ ﴾ "اور (اے نبیؐ!) آپ کو کیا خبر کہ قیامت (فیصلہ کی گھڑی) قریب ہی آ لگی ہو۔"

اچھی طرح ذہن میں رکھئے کہ ایک قیامت تو آخری قیامت ہے' اور ایک میری اور آپ کی انفرادی (individual) قیامت ہے۔ یعنی "میری اور آپ کی موت"۔ وہ تو ہم سب کے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ ہم میں سے کون جانتا ہے کہ وہ کب آئے گی! جگر مراد آبادی مرحوم کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

اربابِ ستم کی خدمت میں اتنی ہی گزارش ہے میری
دنیا سے قیامت دُور سہی دنیا کی قیامت دُور نہیں!

موت کی صورت میں ایک قیامت انسان پر اس دنیا میں بھی آتی ہے جسے ہم قیامتِ صغریٰ کہتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ)) "جو مرگیا اس کی قیامت تو قائم ہو گئی"۔ مہلتِ عمر اور مہلتِ عمل ختم ہوئی —— کسے یقین ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ کل صبح طلوع ہونے والا سورج میں لازماً دیکھوں گا۔ اگر دل میں یہ یقین ہو تو بہت بڑا دھوکہ ہے —— کس برتے پر' کس امید میں تم یہ چیزیں مؤخر کر رہے ہو؟ اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرض ادا کرنے کی فکر کرو۔ اس کے لئے جدوجہد کرو۔ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ اس کے لئے کمربستہ ہو جاؤ' سربکف ہو کر میدان میں نکلو' باطل سے پنجہ آزمائی کے لئے تیار ہو کر آؤ۔ ﴿ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ﴾ کا تقاضا خاتم النبیین والمرسلین کے امتی کی حیثیت سے پورا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو۔ اس کے لئے نظم پیدا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب یعنی قرآن مجید اور میزان یعنی شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام حق کے ساتھ نازل کی ہے اس پر مبنی نظامِ عدل و قسط قائم کرنے کی جدوجہد کرو' ورنہ تم کو کیا پتہ کہ موت تمہارے سرہانے کھڑی ہو' تم اسی تعویق و تاخیر میں رہو اور مہلتِ عمر تمام ہو جائے —— یہ جملہ مفاہیم اس آیت مبارکہ میں بیان ہوئے: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ؕ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ۝ ﴾

آگے فرمایا:

﴿ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ

مِنْهَا وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِى السَّاعَةِ لَفِىْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ○ ﴾

"اس قیامت کے دن کے لئے جلدی وہ لوگ مچاتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے 'مگر جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے رہتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یقیناً اس کا واقع ہونا حق ہے۔ خوب اچھی طرح سن رکھو! جو لوگ اس گھڑی کے آنے کے بارے میں شک میں ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں وہ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں"۔

اس آیت میں نہایت جامعیت 'بلاغت اور پیارے انداز میں قیامت کے بارے میں منکرین اور مؤمنین کے طرزِ فکر و عمل پر تبصرہ فرمایا گیا ہے۔

منکرین کی عجلتِ عذاب

کفار اور مشرکین کج حجتی اور ضد برائے ضد کے طور پر اس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے کہ اے محمد (ﷺ)! لے آؤ وہ قیامت یا وہ عذاب جس کا تم ہمیں ڈراوا دیتے چلے آئے ہو۔ نقلِ کفر کفر نہ باشد۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تمہیں یہ رٹ لگاتے ہوئے دس سال ہو گئے 'آخر وہ گھڑی کب آئے گی؟ یہ سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔ لے آؤ وہ عذاب جس کی دھمکیاں تم ہمیں دیتے چلے آ رہے ہو۔ یہاں تک کہ نضر بن حارث نامی ایک مشرک نے کھڑے ہو کر کہا تھا جس کا قرآن مجید میں سورۃ الانفال میں ذکر ہے :

﴿ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ○ ﴾ (آیت ۳۲)

"اور یاد کرو وہ بات جو ان کفار نے کہی تھی کہ پروردگار! (محمد ﷺ جو پیش کر رہے ہیں) یہ اگر تیری طرف سے واقعی حق ہے اور سچی خبر ہے تو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ۔"

یہ حال تھا ان کی ہٹ دھرمیوں اور ڈھٹائیوں کا۔ ایسی باتوں سے وہ اپنے عوام کو

متاثر کرنا چاہتے تھے جن میں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نفوذ کر رہی تھی۔ گویا ئے نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے! ـــــ مشرکین خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ ہمارے مفادات جو اس مشرکانہ نظام سے وابستہ ہیں' سخت خطرے میں آئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا وہ اس قسم کی باتوں کے ذریعے اپنے عوام پر اپنے خلوص کا اثر قائم کرتے تھے کہ ہمیں اس دعوتِ توحید کے غلط ہونے پر اتنا اعتماد ہے کہ ہم تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ اگر یہ دعوت جو محمد (ﷺ) پیش کر رہے ہیں سچ ہے' حق ہے تو ہم پر عذاب آجائے ـــــ یہ تھا ان کا انداز اپنے عوام کو دعوت سے روکنے کے لئے۔ قرآن اس پر تبصرہ کرتا ہے کہ وہ تو قیامت اور یومِ حساب پر یقین ہی نہیں رکھتے تھے اسی لئے عذاب اور قیامت کی جلدی مچا رہے تھے ـــــ جس کے دل میں یقین ہو گا وہ ہرگز یہ بات زبان پر نہیں لا سکتا۔ یہی بات فرمائی ان الفاظِ مبارکہ میں: ﴿يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا﴾ "اس کے لئے وہی لوگ جلدی مچاتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے"۔

اہلِ ایمان اور خوفِ قیامت

اس کے برعکس اہل ایمان کا یہ حال ہے کہ وہ قیامت کے تصور سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں : ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا﴾ اہلِ ایمان کی اسی صفت کو سورۃ الانبیاء میں بایں الفاظ بیان فرمایا : ﴿اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ○﴾ (آیت ۴۹) "وہ لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور وہ قیامت سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں"۔ اور ان کے قیامت کے خوف اور خشیتِ الٰہی کا نقشہ سورۃ النور کی آیت ۳۷ کے آخر میں یوں کھینچا گیا : ﴿يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ○﴾ "اہل ایمان اس دن کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں کہ جس دن دل الٹ جائیں گے اور نگاہیں پتھرا جائیں گی"۔

قیامت کی ہولناکیوں اور محاسبۂ اخروی سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس طرح ڈرتے

رہتے تھے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ عالم تھا کہ آپؓ کہا کرتے تھے: "کاش میں ایک سوکھا تنکا ہوتا جو جلا دیا جاتا ہے' ختم ہو جاتا ہے' اس سے محاسبہ نہیں ہے۔ کاش میں درختوں پر چہچہاتی ہوئی ایک چڑیا ہوتا جو آج ہے کل نہیں ہو گی' لیکن اس سے محاسبہ کوئی نہیں ہے"۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے انتقال کے وقت کہہ رہے ہیں: "کاش میں برابر سرابر پر چھوٹ جاؤں"۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے وقت آخر اپنے والد کا سر اپنی ران پر رکھا تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ میرا سر نیچے ڈال دو۔ انہوں نے پوچھا: آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ یہ بے چینی کیوں ہے؟ آپ تو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں' آپ کو تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی ہے ـــــ تو جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: "خدا کی قسم! اگر میں برابر سرابر بھی چھوٹ گیا تو بہت بڑی کامیابی تصور کروں گا۔" حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ داڑھی اشکوں سے تر ہو جاتی۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ دوزخ کے ذکر پر اتنے اشکبار نہیں ہوتے جتنے قبر پر ہوتے ہیں۔ آپ نے جواب میں کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قبر آخرت کی منزلوں میں پہلی منزل ہے' اگر کوئی اس سے نجات پا گیا تو اس کے بعد آسانی ہے اور اگر اس سے ہی نجات نہ پائی تو اس کے بعد اس سے بھی زیادہ سختی ہے"۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اکثر اشکبار کہا کرتے تھے کہ "اگر میں دوزخ اور جنت کے درمیان ہوں اور مجھے معلوم نہ ہو کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہو گا' میرے لئے ان میں سے کس کا حکم دیا جائے گا تو میں اس کا حال معلوم کرنے سے قبل راکھ ہو جانے کو پسند کروں گا کہ مبادا میرے لئے دوزخ کا فیصلہ ہو جائے۔"

یہ ہے ان لوگوں کا حال جو اصل عارف ہیں' جو پہچاننے والے ہیں' جو حقیقت کا علم رکھنے والے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو کچھ میں جانتا ہوں اے مسلمانو! اگر تم وہ جانتے تو تمہارے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ تک نہ آتی"۔ او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حقائق بڑے تلخ ہیں۔ جو ان سے غافل ہیں

وہی ہیں جو اس دنیا میں قہقہے بھی لگا رہے ہیں اور محاسبۂ اخروی سے بے نیاز ہو کر بے فکری سے زندگی بسر کر رہے ہیں' دندناتے پھر رہے ہیں۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ موت کے بعد کیا بیتنے والی ہے۔ موت کے اس پردے کے پیچھے کون سے ابدی و لازوال خسارے سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ اس کے برعکس اہلِ ایمان کے متعلق فرمایا :

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ۝ ﴾

"اہل ایمان تو قیامت کی گھڑی کے یقین سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں اور انہیں خوب معلوم ہے کہ وہ گھڑی آکر رہے گی (یہ یقینی' حتمی اور قطعی بات ہے) ـــــ آگاہ ہو جاؤ' (خبردار رہو' اچھی طرح سن رکھو) جو لوگ اس قیامت اور ساعت کے بارے میں جھگڑوں میں پڑے ہوئے ہیں وہ بہت دُور کی گمراہی میں مبتلا ہو چکے ہیں"۔

قبولِ حق میں ایک اہم رکاوٹ اور اس کا حل

توحید عملی کی معراج فریضہ اقامت دین کی ادائیگی کے لئے جِدّوجُہد' محنت و کوشش اور جہاد و کشاکش ہے۔ اسی کے لئے تمام رسولوں کی بعثت ہوئی' کتابیں اور شریعتیں نازل ہوئیں۔ اور اس موضوع پر سورۂ شوریٰ کو ذروۂ سنام (چوٹی) کا مقام حاصل ہے۔ اس راہ کے چند موانعات کا ذکر بھی ہم پڑھ چکے ہیں اور ان کی وجوہ بھی ہمارے سامنے آ چکی ہیں۔ مشرکوں کو یہ دعوت کیوں ناگوار ہے؟ ﴿ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ کے ضمن میں اس بات کو ہم نے سمجھ لیا ہے۔ اہل کتاب کی مخالفت و مخاصمت ﴿ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ﴾ کی تشریح و توضیح کے ضمن میں بیان ہو چکی ہے۔ حق کو اچھی طرح جان اور پہچان لینے کے باوجود تاخیر و تعویق اور لیت و لعل کے رویئے کے چند اسباب بھی ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔

اب اگلی آیت میں ایک رکاوٹ کا براہِ راست تو ذکر نہیں ہے لیکن اس کے

بین السطور وہ رکاوٹ مُنہ سے بول رہی ہے اور اس کا حل مثبت اسلوب میں سامنے لایا جا رہا ہے۔ فرمایا :

﴿ اَللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ ﴾

"اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے' جسے وہ چاہتا ہے سب کچھ دیتا ہے' اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست و غالب ہے"۔

دعوتِ توحید کو قبول کرنے اور اس کے لئے مجاہدہ کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ معاش کا مسئلہ ہوتا ہے۔ تاویل خاص کے طور پر نبی اکرم ﷺ کی دعوتِ توحید پر جن سعید روحوں نے لبیک کہا تھا ان پر جہاں مصائب و مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے وہاں ان کا معاشی مقاطعہ بھی کیا جا رہا تھا۔ لہٰذا اکثر لوگ آپ ﷺ کی دعوت کو حق سمجھتے ہوئے بھی اس کو قبول کرنے سے گریزاں تھے۔ اس لئے کہ اگر معاشی مقاطعہ ہو گیا تو کہاں سے کھائیں گے اور اپنے بال بچوں کو کیا کھلائیں گے۔ اس ماحول میں روکھی سوکھی روٹی کے بھی لالے پڑنے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔

تاویل عام کے لحاظ سے دیکھئے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ہمیں خوب اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ اقامت دین کی جدوجہد فرض ہے : ﴿ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ﴾ لیکن یہ قدم کیسے بڑھائیں! اندیشہ یہ لاحق ہے کہ کھائیں گے کیا؟ پہنیں گے کیا؟ معاش کا بندوبست کیسے ہو گا؟ اس طرف بڑھتا ہوں تو میرا کاروبار بیٹھتا ہے۔ سودی لین دین چھوڑ دوں گا تو اس کا مطلب ہے کہ کاروبار کی بساط لپیٹ دوں۔ اگر رشوت لینا چھوڑتا ہوں تو اپنا معیارِ زندگی کیسے قائم رکھ سکوں گا' جس کا خوگر ہو چکا ہوں۔ میرے بیوی بچے تو پراٹھوں کے عادی ہو چکے ہیں' اب ان کو سوکھی روٹی کیسے کھلاؤں گا! ان کو جو اعلیٰ تعلیم دلانے کے منصوبے ہیں ان پر عمل کیسے ہو گا۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہ ہے وہ سب سے بڑی رکاوٹ اور سب سے بڑا مخمصہ جس سے ایسا شخص دوچار ہوتا ہے اور وہ حق واضح ہونے کے باوجود اس کی طرف پیش قدمی سے ہچکچاتا ہے۔ اسی طرف حضرت مسیح علیہ السلام کے مواعظ میں مختلف اسالیب

سے توجہ دلائی گئی ہے۔ ایک وعظ میں آنحضرت علیہ السلام کے الفاظ آئے ہیں :

"کیوں فکر کرتے ہو کہ کیا کھاؤ گے اور کیا پیو گے؟ تم جنگل کی چڑیوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ نہ ہل چلاتی ہیں' نہ بوتی ہیں' نہ کاٹتی ہیں' نہ کھتوں میں بھر کر رکھتی ہیں' لیکن پھر بھی وہ صبح کو خالی پیٹ اپنے گھونسلوں سے نکلتی ہیں اور شام کو آسودہ ہو کر لوٹ آتی ہیں۔ اے بے یقینو! جو آسمانی باپ ان کو کھلاتا پلاتا ہے کیا وہ تمہیں نہیں کھلائے پلائے گا؟ تم کیوں اس فکر میں مبتلا ہو کہ کیا پہنو گے؟ جنگل کی سوسن کو نہیں دیکھتے! وہ نہ بوتی ہے' نہ کاتتی ہے' نہ بنتی ہے' پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ جتنا شاندار لباس وہ پہنتی ہے سلیمان بھی اپنی ساری شان و شوکت کے باوجود ایسا ملبّس نہ تھا ـــــ جو آسمانی باپ جنگل کی گھانس کو اتنا خوشنما لباس پہناتا ہے کیا وہ تمہیں نہ پہنائے گا۔"

یہ ہے توکّل علی اللہ کا ایک انداز جو اب بھی محرّف اناجیل میں موجود ہے۔ اس لئے کہ نور تو ایک ہی ہے' مشکوٰۃ تو ایک ہی ہے' طاق تو ایک ہی ہے جہاں یہ دیئے اور چراغ روشن ہیں۔ بعد میں تحریفات ہو گئیں یہ بات دوسری ہے۔ ورنہ تورات کا سرچشمہ کون سا ہے! تورات بھی اللہ ہی کی کتاب ہے۔ انجیل کا منبع کیا ہے! وہی اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس ہے۔ اللہ تبارک و سبحانہ ہی کے طاق کا انتہائی روشن چراغ یہ قرآن مجید فرقان حمید ہے جس کو یہ خصوصی تحفظ حاصل ہے کہ اس میں لفظی تحریف نہیں ہو سکتی : ﴿ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝ ﴾ رزاقِ حقیقی اللہ ہی ہے۔ یہی بات یہاں فرمائی : ﴿ اَللّٰهُ لَطِيۡفٌ ۢ بِعِبَادِهٖ يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الۡقَوِىُّ الۡعَزِيۡزُ ۝ ﴾ اللہ تعالیٰ نے رزق اپنے ذمہ لیا ہوا ہے۔ جیسے سورۂ ہود میں فرمایا : ﴿ وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا وَيَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّهَا وَمُسۡتَوۡدَعَهَا ؕ ﴾ "زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ جانتا نہ ہو کہ وہ کہاں رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے"۔ تمام مخلوق کا رزق اللہ نے اپنے ذمے لے رکھا ہے' لیکن تمہیں اعتماد نہیں ہے' تمہیں یقین نہیں ہے' تم اللہ پر توکّل نہیں کرتے' تمہیں اس

پر بھروسہ نہیں ہے' تمہیں اپنے زورِ بازو پر بھروسہ ہے' تمہیں اپنے حساب کتاب پر زیادہ اعتماد ہے۔ اگر تمہاری تھیلیاں بھری ہوئی ہیں تو تمہارے دل کو سکون ہے' تمہاری تجوریوں میں اگر مال ہے تو تمہیں اطمینان ہے' لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں جو کچھ ہے اس پر تمہارا یقین نہیں ہے ـــــ نبی اکرم ﷺ نے زہد کی تعریف میں فرمایا ہے کہ :

((اَلزَّهَادَةُ فِي الدُّنْيَا لَيْسَتْ بِتَحْرِيْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ ' وَلٰكِنَّ الزَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا اَنْ لَا تَكُوْنَ بِمَا فِيْ يَدَيْكَ اَوْثَقَ مِمَّا فِيْ يَدِ اللّٰهِ)) (رواہ الترمذی' عن ابی ذر ؓ)

"دنیا میں حقیقی زہد یہ نہیں ہے کہ حلال کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا لو اور مال ضائع کرو' بلکہ حقیقی زہد تو یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس پر تمہارا یقین و ایمان اور اعتماد زیادہ قائم ہو جائے بہ نسبت اس کے جو تمہارے ہاتھ میں ہے"۔

لیکن اس کے برعکس ہمارا اعتماد اور بھروسہ تو اس پر ہے جو ہمارے ہاتھ میں ہے۔

یہاں فرمایا : ﴿ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ ﴾ "اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے" ـــــ ہم لطف و کرم کے الفاظ بولتے ہیں جس کے معنی مہربانی اور نرمی کے ہیں۔ تو اس لطف سے ہی لطیف ہے' یعنی مہربان۔ لطیف کے ایک معنی باریک بین کے بھی ہیں۔ اس معنی میں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا جوڑا آتا ہے: اللطیف الخبیر' نہایت باریک بین اور باخبر' بڑی باریک شے کو بھی جاننے والا۔ یہاں دونوں معانی ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ دوسرے یہ کہ بندوں کی جو ضروریات ہیں اللہ تعالیٰ ان کی باریک ترین تفاصیل (minute details) کو بھی جانتا ہے۔ تمہیں پتا نہیں کہ تمہیں کس چیز کی ضرورت پڑے گی' اللہ کو معلوم ہے۔ کون بچہ جانتا ہے کہ مجھے ماں کے پیٹ سے برآمد ہوتے ہی غذا کہاں سے ملے گی؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی غذا کا اہتمام اس کی پیدائش سے پہلے کیا ہوا ہوتا ہے۔ تو

اللہ تعالیٰ نے تمہاری تمام ضروریات کا انتظام پہلے سے کیا ہوا ہے' لیکن تمہیں اللہ پر توکّل نہیں ہے۔ جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کے وعظ میں الفاظ آئے ہیں: "لیکن تم یقین نہیں کرتے' تم کو توکّل نہیں ہے' تم انہی اندیشوں میں رہتے ہو کہ کیا کھائیں گے اور کیا پہنیں گے!" ان ہی اندیشوں کو دُور کیا جا رہا ہے : ﴿اَللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ﴾۔

سورۃ الطلاق میں یہی بات بڑے پیارے اور اطمینان بخش الفاظ میں فرمائی گئی ہے :

﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۗ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۗ ﴾

"اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرلے گا تو اللہ اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا اور اس کی ضروریات وہاں سے پوری کرے گا جہاں سے اسے گمان تک نہ ہو۔ اور جو اللہ پر توکل کرے تو اس کے لئے اللہ کافی ہے۔ بلاشبہ اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔"

لہٰذا اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پر توکّل تو کرو' اس کے راستہ پر آؤ تو سہی ــــــ وہ تھوڑا سا امتحان بھی لے گا کہ واقعی توکّل ہے یا جھوٹ موٹ کا توکل کر کے آیا ہے۔ واقعی ہم پر اعتماد ہے یا صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ وہ تھوڑا سا امتحان لے کر اور ٹھونک بجا کر ضرور دیکھتا ہے۔ پھر جو اپنے آپ کو بالکلیہ اس کے حوالے کر دے تو وہ اس کی دستگیری فرماتا ہے ــــــ غور کیجئے کسی شریف النفس اور بامروت انسان کے حوالے اگر آپ اپنے آپ کو کر دیں تو وہ کبھی آپ کو بے سہارا نہیں چھوڑے گا' تو کیا اللہ آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا؟ جس کی شان اسی سورۃ الشوریٰ کی آیت ۲۳ کے آخر میں یہ بیان ہوئی ہے : ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝﴾ "بلاشبہ اللہ بڑا درگزر کرنے والا' قدر دان ہے۔" سورۃ التغابن کی آیت ۱۷ کے آخر میں فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ ﴾ "اور اللہ بڑا قدر دان' بڑا بردبار ہے"۔ اور سورۃ الحدید میں فرمایا : ﴿ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ ﴾ "تم جہاں کہیں بھی ہو گے وہ تمہارے ساتھ ہے"۔

وہ تم سے زیادہ تمہاری ضروریات کو جاننے والا ہے۔ وہ تم سے زیادہ تمہاری مصلحتوں کو جاننے والا ہے۔ تمہارا حال تو یہ ہے کہ تم کبھی کبھی اپنے لئے خیر مانگتے مانگتے شر مانگ بیٹھتے ہو : ﴿ وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ۭ ﴾ انسان بعض اوقات اپنے خیال میں خیر مانگ رہا ہوتا ہے جبکہ حقیقت میں وہ اپنے لئے شر مانگ رہا ہوتا ہے' اس لئے کہ اسے معلوم نہیں ہے کہ جو چیز مانگ رہا ہے وہ میرے حق میں خیر نہیں ہے' شر ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ مچھلی ہے جو تم مانگ رہے ہو حالانکہ وہ سانپ ہے۔ وہ تمہیں مچھلی نظر آتی ہے حقیقت میں وہ سانپ ہے۔ وہ تمہارے ہاتھ نہ لگی تو تم دل گرفتہ ہو گئے کہ اتنی دیر بعد ایک مچھلی نظر آئی تھی وہ بھی نکل گئی' مجھ پر یہ کتنا ظلم ہو گیا۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس کو پکڑ لیتے تو ہلاکت سے دوچار ہوتے۔

یہی بات تو سورۂ کہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ میں بیان ہوئی ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے جب مسکینوں کی کشتی میں عیب پیدا کر دیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جلال آیا تھا اور انہوں نے اعتراض کیا تھا: ﴿ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ﴾ "کیا آپ اس میں شگاف ڈال کر سب کشتی والوں کو ڈبونا چاہتے ہیں؟" اس کا ذکر قرآن میں ہے۔ لیکن سوچئے کہ اس کشتی کے مالکوں نے یہی سوچا ہو گا کہ ہم غریبوں کے پاس روزی کمانے کا یہی ایک ذریعہ تھا' اس میں بھی خرابی پیدا ہو گئی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تشویش ہوئی تو کشتی کے مالکوں کو کیوں نہ ہوئی ہو گی۔ لیکن حضرت خضر علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اس کا تختہ اس لئے اکھیڑا تھا کہ اگر یہ عیب پیدا نہ ہوتا تو بادشاہ نے کشتی ضبط کر لینی تھی۔ وہاں پوری کشتی جا رہی تھی' یہاں تو صرف ایک تختہ اکھڑا ہے جس کی واپس جا کر مرمت ہو جائے گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پوری کشتی گئی تھی' لیکن یہ حقائق کسی کو معلوم نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے

حضرت خضر علیہ السلام کو اس پر مطلع کیا تھا۔ یہی ہے اصل میں ظاہر و باطن کا فرق۔ فرمایا :
﴿ اَللّٰہُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِہٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَھُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ○ ﴾ وہ قوی ہے ' قدرت والا ہے ' توانا ہے۔ وہ زبردست اور غالب ہے۔ وہ جو چاہے کر گزرے ' اس کو روکنے والا کوئی نہیں۔ اس کے خزانوں میں کمی نہیں ہے ' وہ جس کو جتنا چاہے دے دے۔ ﴿ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ○ ﴾ اس کے فیصلے اور اس کے ارادے کے آگے کوئی رکاوٹ بننے والا نہیں ہے۔

مکافات و مجازات کا قانونِ الٰہی

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝ ﴾

"تم میں سے جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں' اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے ہم دنیا ہی میں دے دیتے ہیں' مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔"

یہ بڑا پیارا اور اٹل قانون ہے جو یہاں پہ مختصر طور پر آیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کے دوسرے رکوع میں اس موضوع کا نقطۂ عروج (climax) بیان ہوا ہے۔ ہر مضمون قرآن مجید میں کہیں نہ کہیں اپنی آخری شان میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں فرمایا: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ ﴾ "جو کوئی طالب ہو آخرت کی کھیتی کا۔" اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ فیصلہ کیجئے کہ آپ آخرت کے طالب ہیں یا دنیا کے؟ آپ کا مقصود و مطلوب آخرت ہے یا دنیا؟ عقبیٰ چاہئے یا دنیا چاہئے؟ فیصلہ کیجئے! شعوری طور پر فیصلہ ہو' پھر اس پر ڈٹ جایئے۔ یہ نہ ہو کہ دنیا ذرا ہاتھ سے جاتی دکھائی دی تو دل پژمردہ ہو گیا اور طبیعت مضمحل ہو گئی۔ اگر تم فیصلہ کر چکے ہو کہ تمہاری مراد آخرت ہے تو اگر دنیا میں کمی آ رہی ہے تو تمہیں کوئی پریشانی اور پشیمانی نہیں ہونی چاہئے۔ آدمی طے کرے کہ اوّلیت کس شے کو حاصل ہے' مقدم کیا ہے مؤخر کیا ہے۔ یہ فیصلہ کرے پھر اس پر جم جائے' مستقیم ہو جائے۔ اسی فیصلے کو ارادہ کہا گیا ہے۔ اسی لفظ ارادہ سے لفظ "مُرید" بنتا ہے۔ اَرَادَ' يُرِيْدُ' اِرَادَةً اور اس سے اسم فاعل مُرید "ارادہ کرنے والا۔" اب یا تو کوئی مرید ہے آخرت کا یا کوئی مرید ہے دنیا کا۔ فرمایا: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ﴾ "جو کوئی آخرت کی کھیتی کا طلب گار ہے تو اس کی کھیتی میں ہم برکت دیتے رہتے ہیں۔" اس

میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں جو نیک اعمال انسان آگے بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ انہیں پروان چڑھاتا ہے' پالتا ہے' پوستا ہے' ترقی دیتا ہے۔ ﴿ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا ﴾ "اور جو کوئی طالب بن جاتا ہے دنیا کی کھیتی کا۔" جس کا مقصود و مطلوب دنیا بن گئی ﴿ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ﴾ "ہم اسے دے دیتے ہیں اس میں سے۔" ہم یہ نہیں کرتے کہ جو بہرحال دنیا ہی کا طالب بن گیا ہے' جس کی مراد دنیا ہی ہو گئی ہے اسے ہم دنیا سے بھی محروم کر دیں۔ لہٰذا دنیا میں اسے ہم کچھ دے دلا دیتے ہیں۔ ﴿وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝﴾ "پھر ایسے شخص کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔" تم یہ چاہو کہ یہ بھی ملے اور وہ بھی ملے' دودوا اور روہ بھی چپڑی' یہ مشکل ہے۔ طے کر لو کہ کیا اصل مطلوب و مقصود اور مراد ہے! آخرت کے طلب گار ہو تو آخرت کی کھیتی میں برکتیں ہی برکتیں ہیں' بڑھوتری ہی بڑھوتری ہے' لیکن اگر تم طالب دنیا بن گئے ہو تو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں سے تمہیں کچھ نہ کچھ ضرور دے دے گا لیکن آخرت میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔

طلب کے مطابق دو جُداگانہ انجام

سورۂ بنی اسرائیل کی آیات نمبر ۱۸ اور ۱۹ اس موضوع پر قرآن مجید کا ذروۂ سنام یعنی چوٹی ہیں۔ فرمایا :

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ ﴾

عجلت کہتے ہیں جلدی کو۔ دنیا کے فوائد اور اس کی لذات چونکہ نقد ہیں' موجود ہیں' سامنے ہیں' لہٰذا قرآن اس کو عاجلہ سے منسوب کرتا ہے۔ دنیا عاجلہ ہے۔ فرمایا : ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ ﴾ "جسے یہ جلدی والی نعمتیں مطلوب ہیں۔" یہاں کا عیش' یہاں کا آرام' یہاں کی عزت' یہاں کی دولت' یہاں کی شہرت' یہاں کی

ثروت' یہاں کی وجاہت' یہاں کا اقتدار جسے چاہیے ﴿ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ﴾ "ہم جلدی سے دے دیتے ہیں اس میں سے (یعنی دنیا میں سے) جو ہم چاہیں اور جس کے لئے چاہیں۔" یہاں ایک بات مکمل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو دنیا کے طالب بنیں تو جو وہ چاہیں ان کو مل جائے۔ پھر تو یہاں ہر شخص کروڑپتی ہوتا۔ یہاں تو بہت سے ایسے ہیں جو ساری عمر جوتیاں چٹخارتے دنیا کے پیچھے پھرتے رہتے ہیں پھر بھی اس دنیا سے بہت تھوڑا ہی ان کے ہاتھ لگتا ہے۔ اصل فیصلہ و اختیار تو اللہ تعالیٰ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ جو کوئی اس عاجلہ کا طلب گار بن جائے گا تو ﴿ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ﴾ ہم اسے یہیں جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جو کچھ چاہیں اور جس کے لئے چاہیں ﴿ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ ﴾ "پھر ہم اس کے لئے جہنم کا ٹھکانا مقرر کر دیتے ہیں جس میں وہ جھونکا جائے گا ملامت و مذمت زدہ ہو کر اور دھکے دیئے جا کر۔"

اب اگلی آیت میں ان لوگوں کے انجام کو بیان کیا جا رہا ہے جو اس دنیا میں عاجلہ کے بجائے آخرت کے طلب گار ہوں گے۔ یہاں آپ دیکھیں گے کہ دو شرطیں بیان ہو رہی ہیں۔ فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا ﴾ "اور جو آخرت کا طلب گار بن جائے (اس کا خواہش مند ہو) اور وہ اس کے لئے محنت کرے (دوڑ دھوپ کرے) جیسی کہ اس کے لئے محنت و تگ و دو کرنی چاہیے۔" یعنی اگر زبانی کلامی آخرت کے طلب گار بن کر بیٹھ جاؤ گے تو وہ تمہاری سچی طلب نہیں ہو گی۔ آخرت کے سچے اور حقیقی طالب ہو تو اس کے حصول کے لئے محنت کرو' ایسی محنت جیسی کہ اس کے لئے ضروری ہے۔ دنیا کا جو طالب ہوتا ہے کیا اسے بغیر محنت کے دنیا مل جاتی ہے؟ صبح سے شام تک آدمی کمر توڑ دینے والی مشقت کرتا ہے تب جا کر کہیں دنیا ملتی ہے۔ اگر آخرت کی حقیقی طلب ہے تو اسی کی مطابقت سے محنت و مشقت اور سعی و جد و جہد بھی کرنی پڑے گا۔ آگے فرمایا: ﴿ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ﴾ "اور وہ ہو صاحب ایمان۔" توحید کے التزام اور شرک سے بالکلیہ اجتناب کے ساتھ اللہ پر ایمان رکھتا

ہو' ان تمام احوالِ آخرت پر یقین قلبی رکھتا ہو جن کی خبریں قرآن مجید اور صحیح احادیث میں آئی ہیں' جو رسول اللہ ﷺ کی خاتم النبیین والمرسلین کی حیثیت سے دل سے تصدیق کرتا ہو' تو ایسے شخص کے لئے خوشخبری ہے اس انجام کی کہ : ﴿ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ ﴾ "تو ایسے ہر شخص کی محنت مشکور ہو کر رہے گی۔" اللہ تعالیٰ ان کی قدر فرمائے گا' ان کا مقصود و مطلوب ان کو مل جائے گا۔ اللہ کی رضا ان کو حاصل ہو گی اور آخرت میں ان کے لئے عمدہ راحت' رزق اور نعمتوں سے مالامال جنت ہو گی : ﴿ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝ ﴾ پس سورۂ بنی اسرائیل کی یہ دو آیتیں بہت اہم ہیں اس موضوع پر جو سورۃ الشوریٰ کی زیرِ نظر آیت میں بیان ہوا۔ البتہ ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ یہاں پہلے دنیا پھر آخرت کا بیان ہوا جبکہ سورۃ الشوریٰ میں پہلے آخرت کا پھر دنیا کا اور آخرت میں بے نصیبی کا ذکر ہوا۔

مشرکین کے پاس کوئی شریعت اور دین نہیں ہوتا

آگے فرمایا :

﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۚ ﴾

"کیا ان لوگوں کے لئے (اللہ کے) کچھ ایسے شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے از قسم دین (از قسم نظامِ حیات اور دستورِ زندگی) کوئی ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے جس کا اللہ نے حکم یا اذن نہیں دیا؟"

رسول اللہ ﷺ توحید کی اور اسی توحید پر مبنی دین قائم کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ آپ کے مخاطبین جو اب مخالفین بن گئے ہیں' وہ کون ہیں؟ ایک طرف مشرکین ایک طرف اہل کتاب۔ اہل کتاب کے بارے میں تو ذکر ہو چکا۔ البتہ مشرکین کے بارے میں بات اب مکمل کی جا رہی ہے۔ دنیا میں شرک کے نظام میں یہ بات ملے گی کہ ہر نظامِ شرک میں کچھ دیویاں' کچھ دیوتا' کچھ چھوٹے خدا تو بنا دیئے جاتے ہیں لیکن آج تک کسی دیوی یا دیوتا کا بھیجا ہوا کوئی صحیفہ' کوئی شریعت کوئی کتاب کہیں نہیں ہے۔ وہ بہت سی دیویوں اور دیوتاؤں کو پوج رہے ہیں لیکن کیا وہ

اس کے مدّعی ہیں کہ ہمارے پاس فلاں دیوی یا دیوتا کا دیا ہوا یہ صحیفہ ہے۔ ہندوؤں سے پوچھ کر دیکھئے! وہ کسی دیوی یا دیوتا سے کوئی صحیفہ منسوب کر ہی نہیں سکتے' اس لئے کہ اس کا سرے سے وجود ہے ہی نہیں۔ عرب کے مشرکین لات' منات' عزیٰ' ہبل اور نہ معلوم کن کن ناموں کے بتوں کو پوجتے تھے لیکن ان بتوں نے انھیں کوئی شریعت دی تھی؟ کوئی قانون دیا تھا؟ کوئی نظام دیا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ نہ وہ اس کے مدعی تھے۔ ثابت ہوا کہ یہ تمام اصنام مشرکین کے اپنے ذہنوں کے تراشے ہوئے تھے۔ اگر ان کی کوئی حیثیت ہوتی تو وہ کوئی نہ کوئی شریعت دیتے' کوئی قانون دیتے' کوئی ضابطہ دیتے' کچھ اصول دیتے۔ کسی شے کو حلال ٹھہراتے اور کسی شے کو حرام۔ اگر واقعی کسی میں الوہیت ہو تو وہ دین دے گا۔ حقیقت ان کی کوئی نہیں۔ اسی لئے یہاں استفہامیہ انداز میں فرمایا: ﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ ﴾ "کیا ان کے کوئی ایسے شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے وہ شریعت دی ہو (وہ نظام تجویز کیا ہو) جس کا حکم اللہ نے نہیں دیا؟"

موجودہ مشرکانہ ومبتدعانہ افعال پر انطباق

غور کیجئے ہمارے یہاں بھی جن جن کو پوجا جا رہا ہے کیا ان کی طرف سے کوئی ہدایت ہے' کوئی صحیفہ ہے' کوئی شریعت ہے؟ کیا انہوں نے وصیت کی تھی کہ ہماری قبروں کو عبادت گاہیں بنا لینا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ یہ سب صرف اس لئے ایجاد کر لیا گیا کہ: ﴿ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ یا یہ کہ ﴿ لِیُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ اسی کے پیش نظر ان کے مزاروں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے لئے وسیلہ بن جائیں گے' یہ ہمارے لئے سفارشی بن جائیں گے' یہ وہاں ہمارا بیڑہ پار لگوا دیں گے۔ یہ سب کچھ کیا ہے! ان کو قرآن "اَمانی" کہتا ہے ﴿ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ ﴾ یہ ان کی تمنائیں (wishful thinkings) ہیں' اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ خود کو مسلمان کہنے کے باوجود خود دین پر عمل تو کریں نہیں اور دل میں ان تمناؤں اور

آرزوؤں کی پرورش کرتے رہیں کہ فلاں فلاں اولیاء اللہ ہماری شفاعت کریں گے' کیونکہ ہم نے ان کے مزاروں کی' ان کے مقبروں کی' ان کی درگاہوں کی' ان کے سجادہ نشینوں کی بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں' نذرانے پیش کئے ہیں' چڑھاوے چڑھائے ہیں' ان کی نیاز دی ہے۔ یہ سب کچھ اس دین اور شریعت کے منافی ہے جو جنابِ محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں دیا ہے۔ ایں خیال است و محال است و جنوں!

مشرکین دین سے تہی دست ہوتے ہیں

یہ ہے موضوع اور مضمون آیت کے اس حصے کا کہ شرک کے قائل لوگوں کے پاس کوئی شریعت نہیں' کوئی کتاب نہیں' کوئی صحیفہ نہیں' ان کے پاس کوئی نظام نہیں۔ اس لئے کہ مشرک جن ہستیوں کو الوہیت میں شریک ٹھہراتا ہے ان کی کوئی حقیقت ہے ہی نہیں۔ ﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ ﴾ کیا ان کے ایسے شرکاء ہیں جنہوں نے ان کے لئے دین میں کوئی ضابطہ' کوئی قانون' کوئی دستور' کوئی شریعت انہیں دی ہو؟ موجودہ عیسائیت کیا ہے؟ یہ دین نہیں ہے' محض عقیدہ (dogma) بن کر رہ گئی ہے۔ کسی مشرکانہ نظام میں پوجاپاٹ کے کچھ ضابطے اگر ہیں تو وہ پجاریوں اور پنڈتوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ کم از کم ان کو اتنا کریڈٹ ضرور ملتا ہے کہ انہوں نے جھوٹ موٹ بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ ہمارے فلاں دیوی یا دیوتا کا نازل کردہ ہے' یا پوجاپاٹ کے فلاں طور طریقے فلاں فلاں دیوی یا دیوتا کے مقرر کردہ ہیں۔ ہندوستان یا قبلِ ظہورِ اسلام عرب میں کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ فلاں صحیفہ فلاں دیوی دیوتا یا فلاں بت کا نازل کردہ ہے۔

اجلِ مسمّیٰ کے ضابطہ کا اعادہ

﴿ وَلَوْ لَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾

"اگر آخری فیصلہ کے لئے طے نہ ہو چکا ہوتا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا' اور

یقیناً ان ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

اب ان مشرکوں کے متعلق اسی سُنّت اللہ کے بیان کا اعادہ ہو رہا ہے جو اہل کتاب کے بارے میں بایں الفاظ فرمایا گیا تھا: ﴿ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ﴾ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں پیدا ہونے والے تمام انسانوں کے لئے جہاں ایک مہلت عمر اور مہلت عمل مقرر کر رکھی ہے' وہاں اس دنیا کے آخری انجام یعنی الساعۃ (قیامت) کے لئے بھی اپنے علم ازلی میں ایک وقت طے کیا ہوا ہے۔ اس کا علم اس نے کسی کو نہیں دیا: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۝ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا ۝ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا ۝ ﴾ "(اے نبیؐ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کی گھڑی کب آکر ٹھہرے گی؟ آپ کا کیا کام کہ اس کا وقت بتائیں۔ اس کا علم تو اللہ پر ہی ختم ہے۔" اور جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ "قیامت کی گھڑی کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔" لہٰذا یہاں مشرکوں سے کہا جا رہا ہے کہ اگر آخری گھڑی کا پہلے سے وقت اللہ کے علم میں طے نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارا قضیہ چکا دیا جاتا۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں اکثر و بیشتر ظلم کا لفظ شرک اور ظالمین کا لفظ مشرکین کیلئے آتا ہے۔ جیسے: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾

خلاصہ

اقامتِ دین کا حکم سورۃ الشوریٰ کی عظیم ترین آیت نمبر ۱۳ کے ذریعے آیا: ﴿ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ ﴾ اس امر کی تاکید بھی آئی کہ اقامت دین کے بارے میں تفرقہ میں نہ پڑنا: ﴿ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ﴾ مزید برآں ہمارے سامنے یہ امور آئے کہ اس وقت نبی اکرم ﷺ کے مقابلے میں دو گروہ تھے' مشرکین اور اہل کتاب۔ ان دونوں کا طرزِ عمل' پھر ان دونوں کے بارے میں حضور ﷺ کے لئے رہنمائی بھی ہمارے سامنے آئی۔ پھر حضور ﷺ کو اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لئے کمربستہ ہونے کا حکم اور اپنے موقف پر جم جانے' ڈٹ جانے اور مستقیم ہو جانے کی تاکید آئی۔ حضور

ﷺ سے اس امر کا اعلان بھی سامنے آیا کہ مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے مابین نظامِ عدل و قسط قائم کروں: ﴿ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ﴾ ان تمام امور کے پردے میں تا قیامِ قیامت اہل ایمان کے لئے رہنمائی اور ہدایت آئی ہے کہ ہمارے آخری رسول ﷺ کے امتی ہونے کی حیثیت سے اقامت دین' عدل و قسط پر مبنی نظامِ اجتماعی اور اجتماعی توحید کا قیام و نفاذ ہر مدعیٔ ایمان پر لازم ہے' واجب ہے' فرض ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کام کے لئے جدوجہد کا بیڑا اٹھالیں ان کو ان آیات سے مکمل رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔ جس عظیم کام کے لئے اللہ کے رسول علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے' ان کو بینات عطا ہوتی رہیں' ان کو کتب سماویہ اور شریعت الٰہیہ عطا ہوتی رہی کہ ﴿ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾ نبوت و رسالت کے آنحضور ﷺ پر اتمام و اکمال اور اختتام کے بعد اب یہ کام امت مسلمہ کے ذمہ ہے۔ جو لوگ منہاجِ نبوت کے مطابق فریضہ اقامتِ دین کے لئے کمر کس لیں اُن کے لئے ان آیات میں تمام اصول عطا کر دیئے گئے ہیں۔

اقامتِ دین کی جدّوجُہد کرنے والوں کے اوصاف

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم —— بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ
خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ
يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝
وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى
بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ
هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ
فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ
ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ
يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝
وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ
لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ وَتَرٰىهُمْ
يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ۚ
وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ۝ وَمَا
كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ
اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ۝ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ

لَا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ یَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ
نَّكِیْرٍ ○ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ؕ اِنْ عَلَیْكَ
اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَ اِنْ
تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ○ لِلّٰهِ
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ
اِنَاثًا وَّ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ○ اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ
وَ یَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ○ ﴾

(الشوریٰ : ۳۶-۵۰)

"جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے' اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں۔ جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں اور ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں ـــــ برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے' پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے' اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی۔ ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں' ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہیں۔ جس کو اللہ ہی گمراہی میں پھینک دے اس کا کوئی سنبھالنے والا اللہ کے بعد نہیں ہے۔ تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے اب پلٹنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟ اور تم دیکھو گے کہ یہ جہنم کے سامنے جب لائے جائیں گے تو ذلت کے مارے جھکے جا

رہے ہوں گے اور اس کو نظر بچا بچا کر کن انکھیوں سے دیکھیں گے۔ اس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے کہیں گے کہ واقعی اصل زیاں کار وہی ہیں جنہوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو خسارے میں ڈال دیا۔ خبردار رہو ظالم لوگ مستقل عذاب میں ہوں گے۔ اور ان کے کوئی حامی و سرپرست نہ ہوں گے جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کو آئیں۔ اور جسے اللہ گمراہی میں پھینک دے اس کے لئے بچاؤ کی کوئی سبیل نہیں۔ مان لو اپنے رب کی بات قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس دن تمہارے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہو گی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہو گا۔ اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو اے نبیؐ! ہم نے تم کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا ہے تم پر تو صرف بات پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو اس پر پھول جاتا ہے اور اگر اس کے اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا کسی مصیبت کی شکل میں اس پر الٹ پڑتا ہے تو سخت ناشکرا بن جاتا ہے۔ اللہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جلا کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے۔"

سورۃ الشوریٰ کی متذکرہ بالا آیات میں سب سے پہلے تو اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے اوصاف سامنے لائے جا رہے ہیں کہ ان کو کن اوصاف سے متصف ہونا چاہئے۔ کیا یہ ہر کہ ومہ کا کام ہے! کیا اپنی سیرت و کردار کے داغ لے کر بھی کوئی شخص اس میدان میں اتر سکتا ہے! یا یہ کہ جس کی یہ فریضہ انجام دینے کی نیت ہے کیا وہ ان اوصاف کو بھی اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے تیار ہے!!

اقامتِ دین کی جدّوجہد سے گریز کی وجوہات

(۱) جماعتوں کے تعدّد کا عذر : ہم میں سے اکثر لوگ اس عذر کا سہارا لیتے ہیں کہ ملک میں بہت سی جماعتیں دین کا کام کرنے کی مدّعی ہیں اب کس کا ساتھ

دیں! تو اس کی مثال پہلے ذکر ہو چکی کہ جس طرح ایک پرانے مریض کے علاج کے لئے چار حاذق طبیبوں اور ڈاکٹروں کی پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ تشخیص اور تجویز میں اختلاف ہو سکتا ہے' اسی طرح احیائے دین اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے بھی تشخیص اور طریق کار میں فرق ہو سکتا ہے' جو فی الواقع موجود ہے۔ لیکن اس سے ہمارا فرض تو ساقط نہیں ہو جاتا۔ کھلے دل کے ساتھ ان جماعتوں کا جائزہ لیجئے' ان کی تشخیص اور طریق کار پر غور و خوض کیجئے' پھر جس جماعت پر دل مطمئن ہو جائے تو پورے خلوص کے ساتھ اس میں شامل ہو جایئے۔ آپ ان شاء اللہ ماجور ہوں گے۔ دیکھئے کسی شخص کو ایک جوتا خریدنا ہوتا ہے تو وہ کتنی دکانوں کا چکر لگاتا ہے' کتنے جوتے دیکھتا ہے' پھر ایک کو پسند کر لیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ توحید عملی اختیار کرنا اور اقامتِ دین کے لئے جدّوجہد کرنا اس پر لازم ہے' واجب ہے' فرض ہے تو وہ دین کے لئے کام کرنے والی جماعتوں کا بغور مطالعہ کرے گا اور جس پر اس کا دل ٹھک جائے گا اس کے ساتھ لگ جائے گا۔ جماعتوں کی کثرت کا عذر درحقیقت دین کے کام سے فراریت ہے' شیطان کا فریب ہے' بالکل بے وزن ہے اور عام معنوں میں عذرِ لنگ ہے۔ دین کا کام کیجئے اور یکسو ہو کر کیجئے۔ اپنی اصلاح کو مقدم رکھئے۔ جس جماعت پر دل ٹھک جائے اس میں پوری دل جمعی کے ساتھ شامل ہو جایئے۔ اللہ کے ہاں آپ اپنے خلوص و اخلاص کے باعث ماجور ہوں گے۔

(۲) **معاشی خوف** : دین کی راہ پر آنے کے لئے انسان کو یہ اندیشہ سب سے زیادہ روکتا ہے کہ کیا کھائیں گے کیا پہنیں گے؟ رزق کا معاملہ اس راہ کی بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ پیچھے ذکر ہو چکا کہ ﴿ اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ ﴾ کیوں فکر کرتے ہو! اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے' وہ تو بہت باریک بین ہے' وہ تمہاری ضرورتوں کو تم سے بڑھ کر جاننے والا ہے۔ وہ القوی ہے' العزیز ہے۔ البتہ طے کرنے کی بات یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ شعوری طور پر فیصلہ

کرے کہ اس کا مطلوب دنیا ہے یا آخرت! فیصلہ کن بات یہ ہے۔ ہر شخص اپنے گریبان میں جھانکے تو الا ماشاء اللہ ہمارا یہ حال ہے کہ رجحان کچھ اِدھر ہے کچھ اُدھر۔ آخرت دین کا دل میں شغف ہے' اس کی طرف کشش ہے' اس کے لئے کام کرنے کی طرف طبیعت راغب اور مائل بھی ہے' لیکن جب دنیا کا معاملہ آتا ہے تو دل ڈولنے لگتا ہے' قدم ڈگمگانے لگتے ہیں' آدمی سوچتا ہے کہ ادھر جاؤں یا ادھر جاؤں ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے!

یہ وہ کیفیت ہے جس میں ہم میں سے اکثر مبتلا ہیں۔

(۳) فرصت کا انتظار : کبھی کبھی ہم اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں ذمہ داریاں ہیں' ذرا ان سے نمٹ لیں' پھر ہمہ وقت دین کے کام میں لگ جائیں گے۔ اس سے بڑی خود فریبی اور کوئی نہیں ہے۔ اگر آپ دنیا کے کاموں سے ریٹائر ہو کر دین کے کاموں میں لگیں گے تو اس وقت حال یہ ہو گا کہ توانائیاں اور صلاحیتیں ہی نہیں فہم میں بھی اضمحلال و اختلال آ چکا ہو گا یا آنے والا ہو گا۔ ایک ارذل العمر بھی ہوتی ہے جس کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے : ﴿ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ﴾ اکثر بڑے بڑے عالم و فاضل بھی ایک عمر کو پہنچ کر علم و فہم سے خالی ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دین کے لئے کام کرنے کا اصل وقت تو وہ ہے جب جسم میں توانائی و قوت اور فہم و علم میں صلاحیت موجود ہو۔

محاسبۂ اخروی

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے : ((لَنْ تَزُوْلَا قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْاَلَ عَنْ خَمْسٍ)) "ابن آدم کے قدم اس کٹہرے سے ہرگز ہل نہیں سکیں گے جہاں وہ اپنے رب کے سامنے قیامت کے دن کھڑا ہو گا جب تک اس سے پانچ چیزوں کا حساب نہ لے لیا جائے۔" ((عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ)) "پوری عمر کا

حساب کہ اسے کہاں فنا کیا' کہاں کھپایا؟" ہم نے تمہیں ستر اسی برس دیئے تھے' یہ کہاں گنوائے! ((وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ)) خاص طور پر شباب کا دور' جوانی کا دور' امنگوں کا دور' قوتوں' توانائیوں اور ولولوں کا دور' جب کہ جسم میں جان ہوتی ہے' جب کہ قوائے جسمانی چاق وچوبند ہوتے ہیں۔ پوچھا جائے گا کہ: "وہ جوانی کے دن کہاں کھپائے اور گنوائے؟" عمر کے بارے میں دو سوالوں کے بعد مال کے متعلق دو سوال: ((وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ)) "مال کمایا کہاں سے تھا' (حلال سے یا حرام سے؟) اور خرچ کہاں کیا تھا؟" ادائے حقوق میں' دین کی خدمت میں یا عیاشیوں اور اللّوں تللّوں میں! اور آخری سوال: ((وَعَمَّا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ)) "اور جو علم حاصل ہوا تھا اس پر عمل کتنا کیا؟" گویا جب بھی دینی معلومات کا اضافہ ہوا اسی نسبت سے عمل بھی بڑھا یا نہیں؟ یہ ہیں پانچ سوالات جو ہر ابن آدم سے کیے جائیں گے۔

آخرت اور دنیا کے طلب گاروں کے علیحدہ علیحدہ نتائج!

گزشتہ نشست میں ہم سورۃ الشوریٰ کی آیت ۲۰ کا مطالعہ کر چکے ہیں:

﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝ ﴾

"جو کوئی آخرت کی کھیتی کا طالب ہو گا ہم اس کی کھیتی میں اضافہ کرتے رہیں گے (اس کو پروان چڑھاتے رہیں گے) اور جو دنیا کی کھیتی کا خواہش مند ہے اسے ہم اسی میں سے کچھ دے دلا دیں گے' لیکن پھر اس کے لئے آخرت میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔"

طے کرنے کی بات یہ ہے کہ آپ کا اصل مقصود و مطلوب کیا ہے؟ مقدم کیا ہے' مؤخر کیا ہے! آخرت یا دنیا؟ اسی کے مطابق آخرت میں نتائج مرتب ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی بتدریج ہمارے سامنے وہ اوصاف بھی آئیں گے جو توحیدِ عملی اور اقامتِ دین کے لئے مطلوب ہیں۔ فرمایا:

﴿ فَمَا أُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾

"جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی میں برتنے کا سامان ہے۔"

اس آیت کے پہلے حصے میں دنیا کے سروسامان کی اصل حقیقت بیان فرمائی گئی ہے۔ یہاں شَیْءٍ نکرہ ہے۔ نکرہ تفخیم کے لئے بھی آتا ہے۔ خواہ بڑی سے بڑی چیز دے دی گئی ہو' چاہے قارون کا سا خزانہ دے دیا گیا ہو' اس دنیا میں کچھ بھی دے دیا گیا ہو' وہ اس فانی دنیا کے برتنے کا سامان ہے' اس کے سوا کچھ نہیں' تم سمجھتے ہو کہ یہ میری ملکیت اور میری جائیداد ہے' تم سمجھتے ہو کہ اموال واسبابِ دنیا تم کو دوام بخش دیں گے؟ ﴿ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَهٗ○ یَحْسَبُ اَنَّ مَا لَهٗٓ اَخْلَدَهٗ○ ﴾ حالانکہ یہ سب عارضی اور فانی ہے۔

دنیا کی زندگی کی اصل حقیقت

میں عرض کر چکا ہوں کہ مدنی سورتوں میں سورۃ الشوریٰ کے ہم وزن اور مماثل مضامین سورۃ الحدید میں آئے ہیں۔ مکی سورتوں میں جو مقام سورۃ الشوریٰ کا ہے مدنی سورتوں میں وہی مقام سورۃ الحدید کا ہے۔ چنانچہ اس میں بھی اس حقیقت کو کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ اس دنیا کی زندگی کی اصل حقیقت کیا ہے جس پر تم ریجھے ہوئے ہو۔ فرمایا :

﴿ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ○ ﴾ (الحدید : ۲۰)

یہ دنیا کی زندگی دھوکے کی ٹٹی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا ایک حصہ تو

کھیل کود اور بچپن میں گزر جاتا ہے۔ ذرا بڑے ہوئے تو کھیل کود میں تلذذ کی آمیزش شامل اور کچھ سنسنی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ "لهو و لعب" ہے۔ ذرا اور بڑھے تو بناؤ سنگھار اور ٹیپ ٹاپ کی فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ اچھے سے اچھا لباس ہو' بالکل فیشن کے مطابق ہو' اس سے کہیں ذرا فرق ہوا تو آپ کا دل میلا ہو جائے گا۔ اسے یہاں "زینت" کہا گیا ہے۔ اس سے ذرا آگے بڑھے تو دوسروں کے مقابلے میں فخر پیدا ہو جاتا ہے اپنی دولت پر' اپنی نسل پر' اپنی وجاہت و شوکت پر۔ اسے یہاں "تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ" فرمایا گیا۔ اس سے ذرا آگے بڑھے' جب ادھیڑ عمری کو پہنچے' بڑھاپے کی حد شروع ہوئی تو انسان بڑا واقعیت و حقیقت پسند (realistic) ہو جاتا ہے۔ اب تو خوب دولت چاہئے' صاحب حیثیت اولاد کی بہتات چاہئے۔ اسے یہاں فرمایا گیا: ﴿ تَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ﴾ جوانی کا دَور وہ ہوتا ہے کہ مونچھ نیچی نہ ہو چاہے سب کچھ چلا جائے۔ اس وقت انسان کو اپنی عزت کا اتنا پاس ہوتا ہے' جبکہ بڑھاپے میں آپ کو نظر آ جائے گا کہ اسی شخص کا یہ حال ہوتا ہے کہ مونچھ نیچی ہی نہیں مونڈنے کی نوبت آ جائے تو آ جائے' دولت ہاتھ سے نہ جائے۔ انسان کے یہ مختلف عواطف و میلانات ہوتے ہیں زندگی کے مختلف ادوار میں۔ آخر کار ہوتا کیا ہے کہ انسان کا جسم مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ اس کی روح عالم بالا کی طرف کوچ کر جاتی ہے اور یومِ آخرت یعنی فیصلہ کے دن کا انتظار کرتی ہے۔ اس کی یہاں مثال دی جیسے بارش کے بعد اس سے اگنے والے نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو جاتے ہیں' کھیتی پک کر زرد ہو جاتی ہے' پھر بھس بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ ہیں تمہاری دنیا کی زندگی کے مراحل و مدارج!

رہی آخرت کی زندگی تو اس میں دو قسم کے انجام ہیں: ﴿ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ﴾ یا تو دردناک عذاب ہے' بہت شدید سزا ہے' ﴿ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ﴾ یا اللہ کی مغفرت اور رضا ہے۔

تذبذب خسارے کا سودا ہے

اس آخرت کو سامنے رکھو گے تو یہ دنیا کی زندگی ایک دھوکہ اور فریب کی ٹٹی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہی بات یہاں فرمائی جا رہی ہے : ﴿ فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ ﴾ جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے' بڑی سے بڑی چیز جو تمہیں دی گئی ہے یہ اس دنیا کی برتنے کی چیز ہے' ملکیت نہیں ہے' یہ کسی اور کے لئے یہیں رہ جائے گی۔ ویسے اصل حقیقت تو یہ ہے کہ ﴿ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ آخر کار پوری نوعِ انسانی رختِ سفر باندھے گی اور وراثت صرف اللہ ہی کے لئے رہ جائے گی۔ جب تک سوچ کا یہ انداز نہیں ہو گا اقامتِ دین کی جدوجہد کی وادی میں قدم رکھنا ناسمجھی کی بات ہو جائے گی۔ اس صورت میں انسان قدم قدم پر ٹھٹکے گا جس طرح گاڑی چلتے چلتے رک جاتی ہے' knocking کرتی ہے' اسی طرح کا معاملہ ایسے انسان کے ساتھ ہو گا جو یکسو نہیں ہے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھائے گا تو دو قدم پیچھے ہٹے گا۔ ذرا آگے بڑھنے کو دل چاہے گا تو دنیا پیچھے کھینچے گی۔ وہ حال ہو گا جس کا نقشہ سورۂ نساء میں کھینچا ہے : ﴿ مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ﴾ یہ منافقین کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہو کر رہ جاتے ہیں۔ تذبذب میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ ہدایت کے راستہ پر چلیں یا نہ چلیں۔ اسی کا نقشہ سورۂ حج میں اس طرح کھینچا گیا ہے : ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ﴾ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی بندگی اور پرستش کرنا تو چاہتے ہیں لیکن کنارے کنارے رہ کر' منجدھار میں کودنا نہیں چاہتے۔ وہاں خطرہ ہے' اندیشہ ہے۔ اللہ کی راہ میں کنارے کنارے چلنا چاہتے ہیں۔ لیکن ﴿ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَیْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ ﴾ اگر خیر و خیریت ہو' مال غنیمت مل رہا ہو' دولت بھی آ رہی ہو تو مطمئن ہیں۔ ﴿ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ﴾ اور اگر آزمائش آ گئی' کوئی کٹھن وقت آ گیا' قربانی کا مرحلہ آ گیا' مال دینا پڑے یا جان کے لئے خطرہ آ جائے تو وہ اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔ یہ ہے دنیا اور آخرت دونوں کا گھاٹا' نقصان' خسارہ ﴿ ذٰلِكَ هُوَ

الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝﴾ اور در حقیقت یہی ہے اصل خسران۔

عزمِ مصمم درکار ہے

مذکورہ بالا کردار آپ کو اپنے معاشرے میں انتہائی کثرت سے ملے گا جو یکسو نہیں ہوا ہے۔ ایسے لوگ خال خال ہوں گے جو طے کرلیں کہ میں تو دراصل طالب آخرت ہوں۔ دنیا ملتی ہے ملے‘ نہیں ملتی تو نہ ملے‘ جتنی ملے میرے ربّ کی عطا ہے‘ لیکن دنیا کسی درجے میں بھی میرے لئے مطلوب و مقصود کا درجہ نہیں رکھتی۔ دنیا کے سارے عزائم‘ توقعات (ambitions) ختم کرکے جو شخص اس وادی میں آئے گا وہ ٹھیک ٹھاک چلے گا۔ لہٰذا جو بھی توحید عملی کو انفرادی و اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے کی جدّوجُہد کرنے کا ارادہ کرے اس کا پہلا قدم اور اس کا پہلا وصف یہ ہونا چاہئے کہ اس کا ایک شعوری اور سوچا سمجھا فیصلہ ہو‘ عزمِ مصمم (determination) ہو کہ میرے نزدیک دُنیا کی زندگی‘ اس کا مال و متاع‘ اس کا سازوسامان آخرت کے مقابلے میں قطعی ہیچ ہے۔ میری نظر میں اس کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں ہے۔ اقبال مرحوم کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

یہ مال و دولتِ دنیا‘ یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں‘ لا الٰہ الاّ اللہ

ترجیحات کا مسئلہ

یہ دو چیزیں ہی تو آدمی کو روکتی ہیں۔ سورۂ توبہ میں فرمایا:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾ (التوبۃ : ۲۴)

"(اے نبیؐ!) ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اپنے باپ' اپنے بیٹے' اپنے بھائی' اپنی بیویاں' اپنے رشتہ دار' اپنے وہ مال جو تم نے جمع کئے ہیں' اور اپنے وہ کاروبار جو بڑی محنت سے تم نے جمائے ہیں جن کے کساد کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور اپنے وہ مکان جو تم نے بڑے ارمانوں اور چاؤ کے ساتھ بنائے ہیں' اگر یہ چیزیں تمہیں محبوب تر ہیں اللہ سے' اس کے رسولؐ سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو جاؤ انتظار کرو (گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہو۔ عام فہم زبان میں کہا جائے گا کہ دفع ہو جاؤ) یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔ اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

جب تک آدمی یہ طے نہ کرلے کہ اس کی ترجیحات کیا ہیں' کام نہیں بنتا۔ اس آیتِ مبارکہ کی رو سے ہر شخص اپنے دل میں ایک ترازو نصب کرے' پھر اس کے ایک پلڑے میں آٹھ محبتیں ڈالے اور ایک پلڑے میں تین۔ آٹھ محبتوں میں سے پانچ کا تعلق ہے رشتہ و پیوند سے۔ باپ' بیٹے' بھائی' بیویاں اور عزیز و اقارب' یہ ہیں رشتہ و پیوند اور وہ مال جو کمائے اور جمع کئے اور وہ کاروبار جو محنت سے جمائے اور چمکائے اور وہ بلڈنگیں جو بڑے شوق سے تعمیر کرائیں' یہ تین محبتیں ہیں مال و دولت دنیا۔

یہ مال و دولت دنیا' یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الاّ اللہ

جب تک آدمی ان بُتوں کو نہیں توڑ دے گا اس وقت تک وہ یہ شعوری فیصلہ نہیں کر سکے گا کہ یہ سب کچھ اس فانی دنیا کا عارضی کھیل اور کھلونے ہیں اور میں دنیا کا طالب نہیں ہوں۔ ع بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں! میں دنیا میں اجنبی اور مسافر کی حیثیت سے رہ رہا ہوں۔ مجھے اس دنیا کی ambition نہیں ہے۔ جو شعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں تو آخرت و عاقبت کو اپنی منزل سمجھ کر اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے اپنی جدوجہد کا آغاز کر رہا ہوں تو ایسا شخص پھر اللہ کی راہ میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ آدمی رشتہ و پیوند اور مال و دولت دنیا کی آٹھ محبتوں کے

مقابلے میں تین محبتیں' اللہ کی محبت' اس کے رسول ﷺ کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت ڈالے۔ اگر یہ پلڑا جھک جائے تو فھوالمراد' لیکن اگر آٹھ محبتیں بھاری پڑ جائیں تو اللہ کی طرف سے جھڑکی ہے : ﴿ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ﴾ اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ فاسق قرار دیتا ہے : ﴿ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾

بہتر اور باقی رہنے والی دولت

﴿ فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴾

"جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض چند روزہ زندگی کا برتنے کا ساز و سامان ہے' اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی۔"

دنیا کا یہ ساز و سامان یا تو آپ کی زندگی میں ہی چلا جائے گا یا یہاں رہ جائے گا اور آپ یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ بہرحال ایک نہ ایک دن تو اس سے جدائی ہو گی۔ جیسے سورۂ قیامہ میں فرمایا : ﴿ وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ ﴾ نزع کے وقت انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب تو جدائی ہے اور جب پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جاتی ہے تو اس وقت انسان یقیناً سوچتا ہو گا کہ چاہے ساری دولت چلی جائے لیکن میں یہاں رہ جاؤں۔ لیکن بہرحال اس دنیا سے جدائی انسان کا مقدر ہے۔ یہاں کی دولت اسے یہیں چھوڑنی ہے۔ رہنے والی دولت وہ ہے جو اللہ کے پاس ہے : ﴿ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ ﴾ "ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ پر توکل و اعتماد کیا' اللہ کے پاس بہت عمدہ اور باقی رہنے والا اجر ہے۔"

توکّل ایمان کا ثمرہ ہے

یہاں دو باتیں فرمائیں ایمان اور اپنے رب پر توکّل۔ جان لیجئے کہ ایمان کا

سب سے بڑا ثمرہ توکّل ہے‘ یہ یقین کہ میرے لئے کچھ نہیں ہو گا جب تک اللہ کی توفیق شامل نہ ہو۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کی راہ میں قدم بڑھانے والوں میں یہ دوسرا وصف ہونا ضروری ہے۔ اگر اپنی ذہانت‘ اپنی فطانت‘ اپنی صلاحیت‘ اپنی منصوبہ بندی‘ اپنے زورِ بازو پر تکیہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ قدم رکھنے سے پہلے ہی ناکام ہو گئے۔ اپنی قوت کی نفی کرنا یہ ہو گا کہ میرے کئے کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں تو اللہ کی توفیق‘ اللہ کی تائید‘ اللہ کی نصرت کے بھروسہ پر اس راہ میں قدم رکھ رہا ہوں۔ توکل اس کی ذات پر ہے‘ اپنی ذات پر نہیں‘ اپنے علم پر نہیں‘ اپنے فہم پر نہیں‘ اپنی محنت پر نہیں‘ اپنی مشقت پر نہیں‘ اپنی کوشش پر نہیں۔ کسی شے پر کوئی بھروسہ نہ ہو‘ صرف اللہ پر یقین ہو۔ توکّل کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک کسی کام کے لئے دنیا میں جن مادی اسباب کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب آپ کے پاس ہوں اور پھر بھی آپ کو یہ یقین نہ ہو کہ ان سے کچھ ہو گا‘ بلکہ یقین یہ ہو کہ ہو گا وہی جو اللہ چاہے گا۔ دیا سلائی آپ کے پاس ہے اور سوکھا کاغذ بھی ہے‘ آپ جانتے ہیں کہ دنیا کا جو قانونِ طبعی ہے اور جو مادی اسباب ہیں وہ رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ آپ ماچس سے کاغذ جلا سکتے ہیں لیکن پھر بھی آپ کو یقین رہے کہ میں نہیں جلا سکتا اگر اللہ نہ چاہے۔ اور اگر اللہ چاہے تو دیا سلائی کے بغیر بھی کاغذ جل جائے گا۔ یہ یقین اگر نہیں ہے تو ایمان نہیں ہے۔ پھر تو ایمان ہے مادی اسباب و وسائل پر جن پر آپ کا اعتماد‘ تکیہ اور توکّل ہے۔ اگر مادی اسباب و وسائل پر آپ کو بھروسہ اور توکّل ہے تو درحقیقت آپ مؤمن بالمادہ ہیں۔ آپ کا ایمان ہے مادہ پر اور مادی‘ عادی اور طبعی قوانین پر۔ جب کہ توحید یہ ہے کہ : ﴿ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ○ ﴾ ”اللہ ہی وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں‘ (کوئی کارساز نہیں) لہٰذا اہل ایمان پر لازم ہے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔“ عربی زبان میں حرف جار ”عَلٰی“ عموماً لزوم کے لئے آتا ہے۔ سورۃ طلاق میں فرمایا : ﴿ وَیَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُهٗ ؕ ﴾ یعنی جو اللہ ہی پر بھروسہ

کرے تو اس کے لئے اللہ کافی ہے۔ وہ اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر سے انسان کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ اگر قلبی اطمینان کی یہ کیفیت نہ ہو تو پھر ایمان کہاں رہا اور توحید کہاں رہی!

آیت کے مفاہیم کا حاصل

اس پہلی آیت میں جو باتیں ہمارے سامنے لائی گئیں ان میں ایک تو یہ ہے کہ بندۂ مؤمن کی نگاہوں میں دنیا کی کوئی وقعت نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ ایمان بالآخرۃ اتنا مستحضر ہو کہ اصل منزل آخرت ہی ہو جائے اور دنیا کا سارا ساز و سامان صرف برتنے کی ایک چیز نظر آئے کہ یہ محض استعمال کی چیز ہے' اس سے زائد اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ تیسری یہ کہ اللہ ہی پر توکل قائم ہو چکا ہو' اللہ ہی کی رضا اور خوشنودی ہمارا مطلوب و مقصود اور نصب العین بن جائے۔ واضح رہے کہ جہاں تک "نصب العین" کے لفظ کا تعلق ہے اوّل تو یہ قرآن و حدیث کا لفظ نہیں۔ دوسرے یہ کہ دین کا کام کرنے کے لئے ہمیں ہر اس اصطلاح سے بچنا چاہئے جو کتاب و سنّت سے ماخوذ نہ ہو۔ ہمیں امکانی حد تک اصطلاحات قرآن و حدیث کی اختیار کرنی چاہئیں۔ مثلاً "تصوف" کی اصطلاح کو لے لیجئے' اس کے لئے قرآن و حدیث میں "احسان" کی اصطلاح موجود ہے تو اس سے بچئے اور وہ لفظ استعمال کیجئے جو قرآن و حدیث کا ہے۔ تصوف کا لفظ مجہول النسب ہے۔ آج تک یہ طے ہی نہیں ہو سکا کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے اور کس لفظ سے بنا ہے۔ "تصوف" سے جو مفہوم مراد لیا جاتا ہے اس سے کہیں بہتر طور پر یہ مفہوم لفظ "احسان" ادا کرتا ہے تو اسی کو کیوں نہ اختیار کیا جائے۔ اسی طرح "نصب العین" کتاب و سنّت کی اصطلاح تو ہے نہیں لہٰذا اس کو ترک کر دینا مناسب ہو گا۔ تاہم اگر یہ اصطلاح استعمال بھی کی جائے تو یہ کہنا کہ ایک بندۂ مؤمن کا نصب العین آخرت میں اللہ کی رضا اور دنیا میں اقامت دین ہے' یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ نصب العین کے درجہ میں سوائے اللہ کی رضا اور اخروی فلاح کے دنیا کی کوئی چیز نہیں ہونی چاہئے۔ تب نقطۂ نظر درست ہو گا۔

اقامتِ دین کے لئے جدّوجُہد فرض ہے۔ کسی کام کا فرض ہونا اور ہے' جیسے نماز بھی فرض ہے' روزہ بھی فرض ہے' صاحب نصاب پر زکوٰۃ اور صاحب استطاعت پر حج فرض ہے۔ احساسِ فرض آپ کو آمادہ کرے کہ آپ ان فرائض کو بجالائیں اور اقامت دین کی جدوجہد میں تن من دھن لگائیں' لیکن ان میں سے کسی چیز کو نصب العین کے درجے میں نہ لے آیئے۔ ایک چیز کو نمایاں کرکے آگے لے آنا ترجیح بلا مرجح ہے۔ لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے جو فرائض عائد کردیے ہیں ہمیں ان کو ادا کرنے کے لئے جو بھی ہمارے پاس استعداد و صلاحیت ہے اسے بروئے کار لانا ہے۔ یہ نہ ہو کہ دنیا میں کوئی شے آپ کی نگاہوں میں نصب العین کی حیثیت سے کھب جائے اور وہ آپ کو کھینچ رہی ہو۔ یہ سامنے کی کشش بسااوقات بڑی غلطیوں کا ارتکاب کرادیتی ہے۔ اسی طرح عجلت بھی سر پر سوار ہوجاتی ہے کہ سیدھے راستہ سے نہیں پہنچ پاتے تو شارٹ کٹ اختیار کیا جاتا ہے اور انسان "by hook or by crook" اپنے نصب العین پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لفظ نصب العین ہی استعمال کرنا ہو تو ہمارا نصب العین آخرت میں اللہ کی رضا کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہونا چاہئے۔ ہاں اللہ کی رضا کے حصول کے لئے اس کی طرف سے عائد شدہ فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا اور مطالباتِ دین پورے کرنے کے لئے محنت و سعی کرنا بالکل دوسری بات ہے۔

نہایت اہم ہدایات و تعلیمات!

﴿ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ ﴾

"اور وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں سے پہلو تہی کرتے ہیں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں' اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کردیتے ہیں۔"

پہلی آیت میں تین باتیں آئی تھیں' تین اوصاف آئے تھے : دنیا کی بے مائیگی اور بے ثباتی کا یقین ہونا' آخرت کی چیزوں کا خیر اور ابقٰی ہونے پر یقین ہونا' اور اللہ پر ایمان اور توکّل ہونا۔ یہاں بھی تین باتیں آئی ہیں' تین ہی اوصاف آئے ہیں

کبیرہ گناہوں سے اجتناب' فواحش سے پرہیز اور غصہ کی حالت میں عفو و مغفرت۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اس ترتیب کا اصل حسن کیا ہے! ان میں باہمی ربط و تعلق کیا ہے!

کبائر سے اجتناب

قرآن مجید میں تین مقامات پر یہ مضمون آیا ہے کہ اگر تم کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے صغیرہ گناہوں سے درگزر فرمائے گا۔ یہاں لفظ اجتناب کو بھی سمجھ لیجئے۔ یہ لفظ "جنب" سے باب افتعال کا مصدر ہے۔ جنب پہلو کو کہتے ہیں۔ اجتناب کے معنی ہوں گے پہلو تہی کرنا' دامن بچانا' بچ نکلنا' چھوڑ دینا۔ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کا ذکر قرآن مجید میں تین مقامات پر کیوں اور کس لئے ہے؟ غور کیجئے' ایک مزاج تو وہ ہوتا ہے کہ اصلاحِ ذات کے لئے آدمی بہت حساس ہو گیا ہو کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی باقی نہ رہے۔ ہلکے سے ہلکا داغ بھی سیرت و کردار پر نہ رہے۔ تو ایسے شخص کی ساری عمر اسی ادھیڑبن میں لگ جائے گی۔ پھر وہ تلاش کر کر کے اور خوردبین لگا لگا کے دامن کے داغ دیکھنے اور انہیں دھونے میں ساری زندگی بتا دے گا۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی داغ رہ جائے گا۔ کوئی شخص یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ میں آج "کامل" ہو گیا ہوں۔ جس دن اس نے یہ کہا وہ دن اس کی بربادی کا ہے۔ کیسے کامل ہو سکتا ہے؟ کوئی نہ کوئی بشری اور طبعی کمزوری اور کوئی نہ کوئی خطا تو لگی رہے گی اور وہ زندگی بھر اسی تلاش و جستجو میں اور اس کو رگڑنے میں لگا رہے گا۔ لہٰذا ایسا شخص کبھی بھی اقامتِ دین کی جدّوجُہد کی وادی میں قدم نہیں رکھ سکے گا۔ بلکہ اس طرف اس کا دھیان ہی نہیں جائے گا کہ یہ فرائض میں شامل ہے۔ انسان کے ذہن پر جب مبالغہ کے درجہ میں محض اپنی اصلاح اور سیرت کی صحت کی دھن سوار ہو جاتی ہے تو اس کے نتیجہ میں رہبانیت وجود میں آجاتی ہے۔ خانقاہ ایک institution بن جاتی ہے۔ پھر یہی کام نسلاً بعد نسلٍ ہوتا چلا جاتا ہے کہ دامن پر

کوئی چھوٹا سا داغ بھی نہ رہ جائے۔ لاہور میں ایک بزرگ ہیں' میں ان کا ان کے خلوص و نیک نیتی کی وجہ سے احترام کرتا ہوں۔ ان کا اور ان کے مریدین کا یہ عالم ہے کہ نہ تو گوشت کھاتے ہیں کہ پتہ نہیں ذبح کرنے والے نے صحیح ذبح کیا یا نہیں؟ اس اندیشے کے باعث گوشت نہیں کھاتے۔ پھل نہیں کھاتے' اس لئے کہ باغ عام طور پر ٹھیکہ پر دیئے جاتے ہیں اور ٹھیکہ پر باغ دینا حرام ہے۔ نہ سبزیاں کھاتے ہیں چونکہ ان میں بھی ٹھیکہ شامل ہوتا ہے۔ لے دے کے چند دالوں اور روٹی پر گزارہ ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کس دلیل سے انہوں نے دالوں اور گیہوں کو حلال کیا ہوا ہے! مجھے تو یہ ڈر ہے کہ اگر میں ان کو جا کر بتاؤں کہ حضرت! یہ جو گندم اور دالیں ہیں' ان کے ایک ایک دانے میں سود پیوست ہے' کھاد کی جتنی بھی فیکٹریاں ہیں کیا وہ سودی سرمایہ سے قائم نہیں ہیں؟ کیا کھاد کے بغیر گندم اور دالوں کا کوئی دانہ وجود میں آتا ہے؟

آپ خود سوچئے کہ انسان اس طرح کا تقویٰ اپنے اوپر مسلط کر لے تو زندگی اجیرن ہو جائے گی' وہ کام کیا کرے گا؟ یہ ہوتا ہے وہ انتہاپسندانہ اور متشددانہ انداز کہ انسان اپنے دامن کے داغ دھبے ہی دھوتا رہ جاتا ہے' دین کے لئے کوئی مثبت کام نہیں کر سکتا۔ باطل کو چھوٹ ملی رہتی ہے کہ اس کو کوئی للکارتا ہی نہیں۔ اس کے لئے میدان کھلا رہتا ہے۔ اسی لئے تین جگہ قرآن میں اللہ تعالیٰ بتا رہا ہے کہ موٹی موٹی چیزیں جو ہم نے بتائی ہیں انہیں چھوڑ دو تو چھوٹی چھوٹی خطائیں ہم معاف کر دیں گے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اسے کھلا لائسنس سمجھ لیں اور صغائر کرتے چلے جائیں' معاذ اللہ۔ یہ جو اندازِ فکر ہے کہ مجاہدہ مع النفس ہی ہوتا چلا جائے' اسی میں ساری عمر بیت جائے اور طاغوت کو میدان میں للکارنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے' دین پامال ہو رہا ہو' اس کا استہزاء و تمسخر ہو رہا ہو' شعائرِ دینی کا مذاق اڑایا جا رہا ہو لیکن حمیت دینی اور غیرت ایمانی جوش میں نہ آئے' غم و غصہ کی حرارت پیدا نہ ہو' باطل اور طاغوتی نظام کو بدلنے کا کوئی داعیہ نہ ابھرے'

پُر معصیت ماحول میں انفرادی زہد و تقویٰ ہی کو کافی سمجھا جائے' تو در حقیقت منطقی نتیجہ بن جاتا ہے اس متشددانہ اور انتہاپسندانہ نقطۂ نظر کا کہ آدمی اپنی ذاتی اصلاح اور تقویٰ میں اتنا مستغرق ہو جاتا ہے کہ اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ اللہ کا دین کس غربت اور کسمپرسی میں ہے۔[1]

سورۃ نساء کی آیت ۳۱ میں فرمایا گیا: ﴿ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝ ﴾ (اے اہل ایمان!) اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے باز رہو گے' ان سے اپنا پہلو بچائے رکھو گے' ان سے اپنا دامن پاک رکھو گے جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے تو تمہاری جو اور خطائیں' فروگذاشتیں' برائیاں اور غلطیاں ہوں گی' ہم انہیں صاف کر دیں گے۔ ہم انہیں تمہارے نامۂ اعمال میں سے ساقط کر دیں گے اور ہم تمہیں داخل کریں گے بڑی عزت اور اکرام والی جگہ میں ـــــ یہاں بھی کبائر سے مجتنب رہنے کا ذکر آیا ہے۔

اسی طرح سورۃ نجم میں بھی فرمایا گیا : ﴿ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ

---

[1] اس موقع پر یہ حدیث بھی پیش نظر رہے جو مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اپنی تالیف "خطبات الاحکام" میں امام بیہقی رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کی ہے :

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : ((اَوْحَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ اِلٰى جِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنِ اقْلِبْ مَدِيْنَةَ كَذَا وَكَذَا بِاَهْلِهَا ـ قَالَ:فَقَالَ : يَا رَبِّ اِنَّ فِيْهَا عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ' قَالَ:فَقَالَ : اَقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ ' فَاِنَّ وَجْهَهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ))

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ فلاں فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں سمیت الٹ دو"۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "اس پر جبرئیلؑ نے عرض کیا کہ پروردگار! ان میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے چشم زدن کی مدت بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی"۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: "اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "الٹ ڈالو انہیں پہلے اس پر' پھر دوسروں پر' اس لئے کہ اس کے چہرے کی رنگت کبھی میری (غیرت وحمیت کی) وجہ سے متغیر نہیں ہوئی۔" (مرتب)

وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ ﴾ ”جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی‘ کھلے کھلے قبیح افعال سے مجتنب رہتے ہیں سوائے چھوٹے قصوروں کے۔“

غیرارادی طور پر کوئی خطا اور لغزش ہو گئی‘ کہیں پیر پھسل گیا‘ کبھی دل میں وسوسہ آگیا‘ کسی وقت کوئی غلطی صادر ہو گئی تو جان لو کہ : ﴿ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی ۝ ﴾ (آیت ۳۲) ”بلاشبہ (اے نبی!) آپ کا ربّ واسع المغفرت ہے (وہ بہت معاف فرمانے والا ہے‘ اس کی مغفرت نہایت وسیع ہے۔ اور اے لوگو!) وہ تمہیں اس وقت سے خوب جانتا ہے جب اس نے تمہیں زمین میں سے اٹھایا اور وہ تمہیں خوب جانتا ہے جبکہ تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں جنین کی شکل میں تھے۔ لہٰذا اپنے نفس کے تزکیہ اور پاکی کا دعویٰ نہ کرو۔ (اللہ پر اپنے تقویٰ اور اپنی پاکدامنی کا رعب نہ گانٹھو۔) وہ خوب جانتا ہے کہ کس کے دل میں واقعی و حقیقی تقویٰ ہے“ —— یہ بڑا تیکھا انداز ہے۔ خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جو باریک سے باریک چھلنیوں سے چھاننے پر آجاتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس فضا میں سانس لینا بھی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آپ سود inhale کریں۔ سود اس فضا میں اس طرح پیوست ہے کہ وہ سانس کے ذریعے جسم میں لازماً پہنچتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی حدیث ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ کوئی سود کھائے یا نہ کھائے اس کے غبار سے نہیں بچ سکے گا۔ جیسے کبھی dust suspension ہو جائے‘ فضا غبار آلود ہو جائے تو خواہی نخواہی سانس کے ذریعے خاک اندر جائے گی یا نہیں؟ اسی طرح سے ہمارے موجودہ اقتصادی و معاشیاتی نظام میں سود پیوست اور رچا بسا ہوا ہے۔

اصل ضرورت کیا ہے؟

پُر معصیت اور طاغوتی ماحول میں اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ کبائر سے بچو‘ ان سے بالکلیہ اجتناب کرو۔ ساتھ ہی صغائر سے بھی بچنے کی فکر ہو اور اس نظام کو

بدلنے کی کوشش کرو۔ باطل سے پنجہ آزمائی کے لئے میدانِ عمل میں نکلو' منظّم و متحد ہو کر اسے للکارو۔ خود بھی موحّد بنو اور نظام کو موحّد بنانے کے لئے تن من دھن لگا دو اور اگر ضرورت متقاضی ہو تو اللہ کی راہ میں اپنی گردن کٹا کر سرخرو ہو جاؤ۔ دین کا اصل مطالبہ اور اصل ضرورت یہ ہے۔ اس کا برعکس پہلو یہ ہے کہ توحید عملی کے ذروۂ سنام یعنی اقامتِ دین کی جدّوجہد سے تو کنی کتراؤ اور اپنے دامن کے داغ دھبے ہی دھوتے رہو' ایک دفعہ کافی نہ سمجھو تو پھر دھوؤ' پھر دھوؤ۔ اس طرح تو اس نظام کو بدلنے کی طرف کبھی توجہ نہیں ہوگی۔ تم داغ دھبوں کو دھونے سے فارغ ہی نہیں ہو سکو گے کہ اس میدان میں آؤ اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکارو ـــــ یہ ہے اس جگہ پر اس اندازِ بیان کا اصل مطلب : ﴿ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ ﴾

فواحش سے بچنے کی خصوصی تاکید

یہاں غور کیجئے کہ فواحش کا کبائر سے علیحدہ خصوصی طور پر ذکر کیوں کیا گیا ہے' اور فواحش یعنی بے حیائی کی تمام باتوں سے بچنے کی تاکید علیحدہ سے کیوں کی گئی ہے! اس لئے کہ انسانی سیرت و کردار بلکہ پورے تمدن کے بگاڑ کے لئے سب سے بڑا اندیشہ sex یعنی انسان کا جنسی جذبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید مَرد و زن کی شرم گاہ کو "فرج" کہتا ہے۔ فرج کے معنی ہیں اندیشہ کی جگہ' خطرہ کا مقام۔ پچھلے زمانے میں شہر کے گرداگرد بڑی مضبوط فصیل بنائی جاتی تھی۔ دشمنوں کے حملوں سے شہر کے لئے یہ فصیل پناہ گاہ کا کام دیتی تھی۔ اگر کہیں فصیل میں دراڑ پڑ گئی تو یہ اندیشہ کی جگہ ہے' دشمن اس کے ذریعے شہر میں گھس سکتا ہے۔ اس دراڑ کو عربی میں فرج کہتے ہیں ـــــ اسی طرح سے انسان کی سیرت و کردار کے لئے سب سے زیادہ اندیشے والی چیز درحقیقت فرج ہے۔ اسی لئے عصمت و عفت کی حفاظت کی قرآن مجید میں بہت زیادہ تاکید ہے۔[1]

چنانچہ سورۂ مؤمنون کی آیت ۵ تا ۷ اور سورۂ معارج کی آیات ۲۹ تا ۳۱ میں

ایک شوشے کے فرق کے بغیر بالکل یکساں الفاظ آئے ہیں۔ فرمایا :

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ ﴾

"وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں' سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک یمین ہوں' ان پر ہرگز ملامت نہیں۔ البتہ جو اس کے علاوہ اور کچھ چاہے تو وہی لوگ زیادتی کرنے والے حد سے گزرنے والے ہیں۔"

لہٰذا جہاں کبائر سے بچنا لازم اور ضروری ہے وہاں فواحش سے بچنا بھی لازم اور ضروری ہے ـــــ چونکہ شیطان کا یہ بڑا کاری وار ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ اس نے یہی حربہ پہلے انسانی جوڑے حضرت آدم و حضرت حوا علیہما السلام پر جنت میں آزمایا تھا :

﴿ يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ﴾

"اے بنی آدم! ہوشیار رہنا' کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اسی طرح فتنہ میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیئے تھے تاکہ ان کی شرم گاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھول دے۔"

ابھی اللہ تعالیٰ نے اس جوڑے کو رشتۂ ازدواج میں منسلک نہیں کیا تھا' لیکن

ل اسی لئے ایک حدیث میں حیاء کو ایمان کا ایک شعبہ اور ایک دوسری حدیث میں حیاء کو نصف ایمان کہا گیا ہے : ((اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِيْمَانِ)) اور ((اَلْحَيَآءُ نِصْفُ الْاِيْمَانِ))۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھے دو جبڑوں کے درمیان والی چیز یعنی زبان اور دو ٹانگوں کے درمیان والی چیز یعنی شرم گاہ کی ضمانت دے دو' یعنی اس کو اللہ کی مرضی کے خلاف استعمال نہیں کرو گے تو میں تم کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ (مرتب)

شیطان نے قسمیں کھا کر ان دونوں کو یقین دلایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور ان دونوں کو پھسلا کر اس درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کر لیا جس سے منع کیا گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں ان سے جنت کا لباس اتر گیا اور ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے۔ آج پوری دنیا اسی فحاشی' بے حیائی اور عریانی کی زد میں ہے۔ مادہ پرستی کے شرک کے ساتھ ساتھ عریانی و بے حیائی دجالی فتنوں میں بڑے مؤثر فتنے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ اعراف میں حرام چیزوں میں فواحش کو مقدم کیا گیا۔ فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ.... ﴾ "(اے نبی!) کہہ دیجئے میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ بے شرمی و بے حیائی کے کام ہیں' خواہ کھلے ہوں یا چھپے......"

ترکِ فرائض بھی کبائر میں شامل ہے

کبیرہ گناہوں میں شرک تو وہ گناہ ہے جس کی کسی طور پر معافی نہیں ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ﴾ باقی کبیرہ گناہوں میں سے چند یہ ہیں۔ فرائض کو ترک کر دینا کبائر میں شمار ہو جائے گا۔ نماز چھوڑی تو یہ کبیرہ گناہ ہے۔ بغیر شرعی عذر کے روزہ نہیں رکھا' یہ کبیرہ گناہ ہے۔ اگر آپ صاحبِ نصاب ہیں اور زکوٰۃ نہیں دے رہے اور صاحبِ استطاعت ہوتے ہوئے بھی حج کرنے کی کوشش نہیں کر رہے' یہ دونوں کبیرہ گناہ ہیں ـــــ اقامتِ دین کی جدّوجُہد فرض ہے۔ بالخصوص جن پر اس کی جدوجہد کا فرض ہونا واضح ہو جائے ان کا اس کو ترک کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ قتل ناحق' سود کا لین دین' زنا اور جن کاموں کو کتاب و سنت نے واضح نصوص کے ذریعے حرام قرار دیا ہے ان میں سے کوئی کام کرنا تمام فقہی مکاتیب فکر میں ان کو کبائر میں شمار کیا گیا ہے ـــــ ان سب سے ایک مسلمان کو بالکلیہ اجتناب کرنا لازم ہے۔ ان سے وہ اپنا دامن بچائے اور باقی کی اصلاح کی بھی کوشش کرتا رہے۔ اس بات کا منتظر نہ رہے کہ میں جب اپنی کامل اصلاح کر لوں گا تب میں دعوت و تبلیغ اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے میدان میں آؤں گا۔ ایسی صورت میں کبھی بھی اس کی نوبت

نہیں آئے گی اور مہلتِ عمر یونہی تمام ہو جائے گی۔ قرآن مجید کی دعوت تو یہ ہے کہ کبیرہ گناہوں سے اپنا دامن پاک کر کے میدان میں آؤ' باطل کو للکارو' اقامتِ دین کی جدّوجہد میں شامل ہو جاؤ۔ البتہ فحاشی کی ہر شکل اور ہر نوع سے بچو' یہ سب سے زیادہ اندیشہ کی بات ہے۔

حالتِ غُصّہ میں اَنسب واَحسن رویّہ

﴿ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ ﴾ تیسری ہدایت اور تعلیم اس بات کی دی جا رہی ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں میں یہ وصف ہونا چاہئے کہ وہ کوئی کام غصہ کی حالت میں نہ کریں۔ یہ بات نہیں ہے کہ انسان میں غصہ نہ ہو' غصہ ہونا بھی ضروری ہے۔ غیرت و حمیت کا ہونا بھی ضروری ہے' انتقام کا جذبہ بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ ایک تصور ہے خانقاہی تصور' بدھ مت کے بھکشوؤں کا تصور' گوتم بدھ کا دیا ہوا "اہنسا" کا تصور۔ اسلام میں مستقل بالذات یہ تصورات نہیں ہیں۔ اسلام میں تو اللہ کے لئے اور اللہ کے دین کا بول بالا کرنے کے لئے تلوار ہاتھ میں لینا چوٹی کی نیکی ہے : ﴿ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ ﴾ اور جیسے سورۂ صف میں فرمایا : ﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ ﴾ قرآن بالکل مختلف قسم کے انسان بنانا چاہتا ہے۔ یہ بدھ مت کے بھکشو نہیں ہیں' یہ خانقاہی مزاج کی شخصیتیں نہیں ہیں' بلکہ ان کا مزاج کچھ اور ہے' جو اقامت دین کی جدوجہد کے لئے درکار ہے۔ وہ کیا ہے؟ غصہ آئے' لیکن حالت غصہ میں کوئی اقدام نہ ہو! ہوا تو معاملہ غلط ہو جائے گا۔ غصہ آئے تو معاف کرو۔ ہاں سوچ سمجھ کر' cool mindedness کے تحت اگر کوئی سخت قدم بھی اٹھانا پڑے تو اٹھانا ہو گا۔ یاد کیجئے محمد رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کے معاملے میں کتنا بڑا اقدام اٹھایا' حالانکہ آپؐ سے بڑھ کر رحیم' شفیق' رؤف اور ودود انسانوں میں کون ہو گا! جو رحمۃٌ للعالمین بن کر آئے' جن کے متعلق قرآن گواہی دیتا ہے :

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ﴾ "اے نبی یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ آپؐ ان کے حق میں بہت ہی نرم خو ہیں" ـــــ لیکن وہی محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہیں جنہوں نے دین کے لئے یہ بھی کیا ہے کہ یہودیوں کے ایک قبیلہ کے جتنے بھی جوان مرد تھے ان کو اپنے سامنے ذبح کرایا ـــــ بنو قریظہ کا یہ معاملہ ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ اس قبیلہ کی اللہ نے مت ماردی تھی کہ ہتھیار ڈالنے کے بعد اپنا معاملہ نبی اکرم ﷺ جیسے رؤف' ودود اور رحیم و شفیق ذات کے سپرد کرنے کے بجائے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم بنانے پر اصرار کیا۔ چونکہ نبی اکرم ﷺ کے مدینہ میں ورودِ مسعود سے قبل اس قبیلے کے ان سے حلیفانہ تعلقات تھے لہٰذا امید تھی کہ وہ ان کا لحاظ رکھیں گے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عین یہودیوں کی اپنی شریعت کے مطابق یہ فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے تمام جوان مرد قتل کر دیئے جائیں اور بقیہ لوگوں کو غلام بنا لیا جائے ـــــ فیصلہ تو ان کا تھا لیکن اس کا نفاذ تو آنحضور ﷺ کے حکم پر ہوا ـــــ رحمۃٌ للعالمین ﷺ نے یہ فیصلہ نافذ فرمایا' لیکن اپنے لئے نہیں' دین اللہ کے غلبہ کے لئے۔

اقامتِ دین کی جدّوجہد میں وہ موقع بھی آیا کہ بدر کے اسیروں کے متعلق حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رائے پیش کی تھی کہ ہر مؤمن ان میں سے اپنے قریب ترین عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ نبی اکرم ﷺ نے دوسرے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے کے مطابق ان اسیروں کو فدیہ لے کر رہا کر دیا' لیکن بعد میں سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تصویب فرمائی ـــــ بہرحال انقلابی عمل میں ایسے مواقع آتے ہیں کہ سختی بھی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ایک ہے جذبات میں آکر سختی کرجانا' یہ درست نہیں ہے۔ غصہ آیا ہو اور اس حالت میں آپ کوئی اقدام کر بیٹھیں تو اکثر غلط قدم اٹھا بیٹھیں گے ـــــ لہٰذا غصہ میں تو معاف کر دینا ہی افضل و احسن ہے۔ جیسے مؤمنینِ صادقین کے اوصاف میں فرمایا : ﴿ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ ﴾ "یہ لوگ وہ ہیں جو غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو

معاف کرنے والے ہوتے ہیں۔" ـــــ اس آیت میں اقامتِ دین کی جدّوجُہد اور توحیدِ عملی کے عاملین کا تیسرا وصف بیان فرمایا کہ: ﴿ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ۝ ﴾ "اور جب انہیں غصہ آجائے تو معاف کر دیتے ہیں' درگزر سے کام لیتے ہیں۔"

اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کرنے والوں کے خصوصی اوصاف

آگے اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے لئے چار مزید اوصاف کا بیان آ رہا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۝ ﴾

"اور جو لوگ اپنے رب کے حکم پر لبیک کہتے ہیں' اور نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات باہم مشورے سے چلاتے ہیں' اور جو کچھ بھی رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔"

پہلا وصف : استجابت

اجابت اور استجابت ہم معنیٰ الفاظ ہیں۔ اجابت قبولیت کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۶ اور سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۶ میں استعمال ہوا ہے۔ فارسی کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید!

اس کا ترجمہ بھی شعر ہی میں ہے ؎

ڈرو مظلوم کی آہوں سے جب اٹھتی ہیں سینوں میں
قبولیت ہے کرتی خیر مقدم چرخ سے آکر!

سورۃ البقرۃ کی آیت سے صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ

دو طرفہ معاملہ ہے' فرماتا ہے : ﴿ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾ "میں تو ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں اور قبول کرتا ہوں جب بھی اور جہاں بھی وہ مجھے پکارے۔" میں نے کوئی خاص وقت مقرر نہیں کیا ہوا ہے کہ بس صرف اس میں انٹرویو ہو سکتا ہے یا درخواست سنی جا سکتی ہے یا پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک شرط ہے : ﴿ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي ﴾ "پس میرے بندوں کو بھی چاہئے کہ میری پکار پر لبیک کہیں (میری ہدایات کو قبول کریں) اور مجھ پر ایمان رکھیں۔" یہ نہیں کہ اپنی باتیں تو مجھ سے منوائیں اور میری نہ سنیں۔ یہاں فرمایا : ﴿ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ ﴾ "جن لوگوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا (اسے قبول کیا)"۔ کون سی پکار؟ یہ کہ دین کو قائم رکھو یا دین کو قائم کرو اور اس دین کے بارے میں متفرق نہ ہو جاؤ' دین کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کردو۔

دوسرا وصف : اقامتِ صلوٰۃ

﴿ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ﴾ "اور انہوں نے نماز قائم کی۔" دین اللہ کا ہے اور اس کو قائم کرنے کے لئے آپ کے دل میں اتنا ہی شدید جذبہ ہو گا جتنی اللہ کی محبت آپ کے دل میں ہو گی۔ فرض کیجئے کہ کوئی دولت کا پجاری ہے اور وہ دن رات اس کے لئے محنت کر رہا ہے تو جتنی اسے دولت سے محبت ہو گی' اتنی ہی وہ محنت کرے گا۔ محبت کم ہو گی تو مشقت بھی کم ہو جائے گی۔ اگر اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لئے جدّوجُہد کرنی ہے تو اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط رکھنا ہو گا۔ اور تعلق مع اللہ کی مضبوطی کے لئے جو ستون ہے' جو عماد الدّین ہے' وہ ہے نماز۔ لہٰذا فرمایا گیا : ﴿ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ﴾ "اور انہوں نے نماز کو قائم رکھا۔" یہ نماز درحقیقت اللہ تعالیٰ سے تعلق اور اللہ کی یاد کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ فرمایا : ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾ "نماز قائم کرو میری یاد کے لئے۔" اللہ کے ساتھ تعلق میں اگر کہیں ذرا کمی آنے لگے تو اسے تازہ کرنے کے لئے نماز ہی سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ حفیظ

جالندھری کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

سرکشی نے کر دیئے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

ایک بندۂ مؤمن نے اللہ تعالیٰ سے جو عہدِ بندگی استوار کیا ہوا ہے سجدے میں جا کر گویا وہ اس عہد کو از سرِ نو تازہ کرتا ہے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر بھی خوب ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

مؤمن اس دُنیا میں رہتے ہوئے دُنیا سے بلند تر ہو کر زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا اصل تعلق صرف اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس نماز اللہ سے تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

تیسرا وصف : شورائیت

﴿وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ اب جو اقامتِ دین کی جدّوجُہد کرنی ہے‘ کفر سے ٹکرانا ہے‘ باطل کا استیصال کرنا ہے‘ حق کا بول بالا کرنا ہے‘ غلبۂ دین کے فریضہ کو انجام دینا ہے‘ اس کے لئے ایک شرطِ لازم یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس کام کے لئے جمع ہوئے ہوں‘ منظم ہوئے ہوں‘ وہ باہمی مشورے کا نظام قائم کریں۔ کسی میں انانیت نہ آنے پائے۔ اس میں کوئی Totalitarianism نہ ہو کہ بس میں مختارِ کل ہوں۔ یہ بات اگر ہو سکتی تھی تو انبیاء و رُسل کے لئے ہو سکتی تھی جن کا تعلق تارِ وحی کے ذریعے اللہ کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ جب رسولوں نے یہ نہیں کیا تو ہما شما کس قطار و شمار میں ہو سکتے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران میں فرمایا : ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ ”(اے محمد ﷺ!) اپنے ان ساتھیوں سے مشورہ لے لیا کیجئے۔“ ان کو بھی مشورہ میں شریک کر لیا کیجئے۔ ﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ﴾ مشورے کے بعد آپ جو فیصلہ کر لیں تو اس پر

اللہ پر توکل کرتے ہوئے عمل کریں۔ پھر یہ نہیں ہونا چاہئے کہ فیصلہ بدل دیا جائے کہ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ دعوتِ توحید عملی کے داعی اور تحریک اسلامی کے قائد کے لئے عزیمت لازمی ہے۔ مشورہ ضرور کرے' پھر فیصلہ کرے' لیکن جب فیصلہ کر لیا جائے تو معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیا جائے۔ ﴿ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ اسی کی مثال ہمیں غزوۂ احد کے واقعہ میں ملتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مشورہ کیا کہ دشمن مدینہ پر چڑھائی کے لئے آرہا ہے' کیا کرنا چاہئے؟ حضور ﷺ کی اپنی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں محصور ہو کر مدافعت کی جائے جیسے قریباً دو سال بعد غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ عبداللہ بن اُبَی رئیس المنافقین کی رائے بھی یہی تھی۔ رائے میں تو اتفاق ہو سکتا ہے' چاہے کوئی شخص نیک نیتی سے رائے دے رہا ہو یا بدنیتی سے۔ لیکن کچھ مسلمانوں نے' خاص طور پر انہوں نے جو غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے یا بعد میں اسلام لائے تھے جن میں جوشِ جہاد بہت تھا' اصرار کیا کہ ہم قلعہ بند ہو کر مدافعت کیوں کریں؟ ہمیں تو شہادت مطلوب ہے ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

تو کیوں نہ میدان میں جا کر کفر سے مقابلہ کریں؟ نبی اکرم ﷺ نے اپنے چند ساتھیوں کا جب یہ جوش و خروش دیکھا تو فیصلہ فرما دیا کہ میدان ہی میں مقابلہ ہو گا۔ اس کے بعد آپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں تشریف لے گئے اور باہر وارد ہوئے تو زرہ بکتر پہنی ہوئی اور ہتھیار لگائے ہوئے تھے۔ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی' آپ نے کبھی یہ صورت اختیار نہ کی تھی۔ اب ان ساتھیوں کو احساس ہوا کہ جن کا میدان میں مقابلہ کرنے پر اصرار تھا کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ کوئی خاص بات ہے جو حضور ﷺ زرہ پہن کر تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے کہا حضور ﷺ ہم اپنی بات واپس لیتے ہیں' اب جو بھی آپ کا فیصلہ ہو ــــــ حضور ﷺ نے فرمایا: کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ ہتھیار لگا کر اتار دے۔ حضور ﷺ نے میدان ہی میں چلنے کا فیصلہ برقرار

رکھا۔ توکل تو اللہ ہی پر ہے' ہوگا وہی جو وہ چاہے گا' وہ چاہے تو ہماری غلطیوں کو condone کردے' ان کی تلافی فرما دے۔ بلکہ بسااوقات یہ ہوتا ہے کہ غلطی آپ کے حق میں مفید ہو جاتی ہے۔ فیصلہ تو اس کا ہوتا ہے۔ یہ بات ہے جو یہاں فرما دی گئی کہ ﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ﴾ اے نبی یہ تو اللہ کا بڑا فضل ہے اور اس کی رحمت ہے کہ آپؐ اپنے ساتھیوں کے حق میں بہت نرم خو ہیں۔ اگر آپؐ تُند خُو ہوتے تو یہ آپؐ کے ارد گرد سے منتشر ہو جاتے۔ اقبال نے کہا ہے ۔

کوئی کارواں سے چھوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

کسی قافلہ کو لے کر چلنے کے لئے قائد میں خوئے دلنوازی بھی ضروری ہے اور جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ میں یہ وصف اپنے عروج پر تھا کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ حضور ﷺ کی سب سے زیادہ عنایت میری طرف ہے' سب سے زیادہ توجہ میری جانب ہے۔ تو فرمایا اگر خدانخواستہ آپؐ کا طرزِ عمل یہ ہوتا کہ آپؐ تند مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ سب ساتھی اِدھر اُدھر بکھر چکے ہوتے' منتشر ہو چکے ہوتے۔ ﴿ فَاعْفُ عَنْهُمْ ﴾ پس آپؐ ان کی خطاؤں سے درگزر کیا کیجئے۔ ﴿ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ ﴾ اور اللہ سے بھی ان کے لئے استغفار کیا کیجئے۔ ﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ﴾ اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہا کیجئے۔ ﴿ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ اور جب آپؐ فیصلہ کرلیں تو پھر اللہ پر توکل کیجئے۔

یہاں فرمایا : ﴿ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ یہ اس لئے کہ ایک قافلہ' ایک جماعت' ایک تنظیم کے ہم مقصد ساتھیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی اور یک جہتی ہونی لازم ہے۔ وہ پیدا نہیں ہوگی اگر مشورہ نہ ہو۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا کہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیا کیجئے' تابہ دیگراں چہ رسد! دوسرا کون کہہ سکتا ہے کہ میں مشورہ سے مستغنی ہوں۔ لہٰذا ہمیشہ کے لئے طے فرمادیا

گیا : ﴿ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾

چوتھا وصف : انفاق

اس آیت میں اقامت دین کا فریضہ انجام دینے والوں کا چوتھا وصف بیان ہو رہا ہے : ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ○ ﴾ "ہم نے انہیں جو بھی رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" آیت کے اس حصہ کی توضیح و تشریح سے قبل اب تک جو کچھ ذکر ہوا اس پر نگاہ بازگشت ڈال لیجئے۔ پہلی آیت میں تین اوصاف بیان ہوئے تھے۔ (۱) دُنیا کو صرف برتنے کی چیز سمجھنا۔ (۲) آخرت کی زندگی ہی کو اصل خیر اور باقی رہنے والی شے جاننا۔ (۳) اللہ تعالیٰ ہی پر توکّل کرنا۔ دوسری آیت میں بھی تین اوصاف آئے ہیں۔ (۱) کبیرہ گناہوں سے اجتناب۔ (۲) فواحش سے پرہیز۔ (۳) غُصّہ کی حالت میں عفو و درگذر سے کام لینا۔

زیر نظر آیت میں اب تک تین اوصاف ہمارے سامنے آئے ہیں : (۱) دعوتِ اقامتِ دین پر لبیک کہنا' (۲) نماز کو قائم کرنا' (۳) اپنے معاملات میں مشاورت کرنا۔ گویا اب تک نو اوصاف سامنے آچکے ہیں۔ اب دسواں وصف سامنے آرہا ہے اور وہ ہے : ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ○ ﴾ ہم نے انہیں جو بھی رزق دیا ہے' وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہاں تک دس اوصاف پورے ہوتے ہیں۔

چونکہ اکثر لوگ بنیادی باتوں سے واقف نہیں ہیں اس لئے ان کے ذہنوں کی رسائی یہاں پر يُنْفِقُوْنَ (خرچ کرنے) کے اصل اور حقیقی مفہوم تک نہیں ہو پاتی۔ دیکھئے خرچ تو سب ہی لوگ کرتے ہیں۔ دولت ہے' کمائی ہے' وہ آخر خرچ کرنے کے لئے ہی ہوتی ہے۔ بخیل سے بخیل آدمی بھی آخر کچھ نہ کچھ خرچ کرتے ہیں' بنیوں کو بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر اپنی بیٹیوں کی شادی کے مواقع پر تو وہ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ مکان بناتے ہیں تو بھی دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ ایک

ہے اپنی ذات پر' اپنی ضروریات پر خرچ کرنا۔ وہ یہاں مراد نہیں ہو سکتا' اس لئے کہ اس مقصد کے لئے تو سب ہی خرچ کرتے ہیں۔ یہاں اصل مراد ہو گی اللہ کے لئے خرچ کرنا۔

پھر اللہ کے لئے خرچ کرنے کی بھی تین مدّیں ہیں۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ اللہ کو راضی کرنے کے لئے آپ اپنا مال خرچ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی مد ایک ہے ذوی القربیٰ' یتامیٰ' مساکین' فقراء' بیوگان' مسافروں کی مدد کرنا' سائلوں کو دینا' جو مقروض ہوں ان کو قرض سے نجات دلانا' جو غلامی کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہوں ان کی گردنیں چھڑا دینا۔ جیسا کہ آیتِ برّ (سورۂ بقرہ کی ۱۷۷ویں آیت) میں فرمایا: ﴿ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ﴾ اس مد کو قرآن مجید کی اصطلاح میں صدقات و خیراتِ نافلہ کہا جاتا ہے۔ زکوٰۃ کو بھی اس میں شامل کر لیجئے' وہ فرض ہے اور یہ دوسری مد ہے۔ اس کی مدات اکثر تو یہی ہیں جو آیتِ برّ میں بیان ہوئیں۔ کچھ کا ان میں اضافہ ہے۔

انفاق کی ایک تیسری مدّ ہے اور وہ ہے اللہ کے دین کے لئے خرچ کرنا۔ یعنی دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت میں پیسہ لگانا' اقامتِ دین کی جدّ و جُہد کے لئے اپنا مال خرچ کرنا۔ اگر قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ آجائے تو اس کے لئے سرو سامان' اسلحہ وغیرہ کی فراہمی میں دل کھول کر پیسہ خرچ کرنا۔ یہاں درحقیقت یہ تیسری مد مراد ہے' کیونکہ سیاق میں اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کا حکم آچکا ہے۔ اقامتِ دین کا فریضہ کیسے انجام پائے گا اگر مال خرچ نہیں کریں گے؟ یہی وجہ ہے قرآن مجید میں جہاں کہیں جہاد کا ذکر آیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں مال کا ذکر مقدّم ہو گا۔ جیسے سورۂ حُجرات میں سچے مؤمنین کے اوصاف بیان ہوئے:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ

الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾ (آیت ۱۵)

سورۂ صف میں فرمایا :

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ﴾ (آیات ۱۰'۱۱)

سورۂ توبہ میں فرمایا :

﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ ﴾ (آیت ۲۰)

جہاد میں مال خرچ ہوتا ہے' بلکہ دعوت و تبلیغ کے مرحلے پر تو مال ہی خرچ ہو گا۔ آگے چل کر اقامتِ دین کی جدّ وجہد میں وہ مرحلہ بھی آسکتا ہے کہ نقد جان ہتھیلی پر رکھو اور میدان میں آجاؤ۔ کفن سر سے باندھو اور باطل کے مقابلہ میں نکلو۔ اس مرحلہ کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جنگ اور اس کے نتیجے میں شہادت کی تمنا ہر دل میں لازماً ہونی چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مرحلہ آپ کی زندگی میں درپیش نہ ہو۔ اقامت دین کی جدوجہد آپ نے شروع کی ہے لیکن قتال بالسیف کا مرحلہ آپ کی زندگی میں نہیں آیا تو کوئی بات نہیں' مگر نیت و ارادہ اور تمنا و آرزو دل میں رہے۔ اللہ کی راہ میں جنگ اور شہادت کی تمنا سے جو سینہ خالی ہے اس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا : ((فَقَدْ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ)) ایسے شخص کی موت ایک قسم کے نفاق پر آئی' وہ ایک نوع کے نفاق پر مرا۔ اللہ کے دین کے لئے مال خرچ کرنے کے لئے اصطلاح آتی ہے انفاق فی سبیل اللّٰہ۔ یہاں بھی یہی اصطلاح استعمال ہوئی۔ ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾

ایک اور بات بھی اس مقام پر سمجھ لیجئے۔ رزق کا اطلاق بھی صرف مال یا ضروریاتِ زندگی پر نہیں ہوتا' بلکہ توانائیوں' صلاحیتوں اور قوتوں پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح "انفاق" بھی جامع اصطلاح ہے۔ اس کا اطلاق اللہ کی راہ میں مال خرچ

کرنے کے ساتھ اپنی توانائیاں' صلاحیتیں اور قوتیں صرف کرنے پر بھی ہوگا۔ اس آیت میں چار اوصاف بیان ہوئے : ﴿ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ ﴾ وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا۔ ﴿ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ﴾ اور اللہ سے اپنے تعلق کو قائم رکھنے کے لئے نماز کو قائم رکھا۔ ﴿ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ﴾ جماعتی زندگی کے اندر ہم خیالی اور باہمی اعتماد کی فضا برقرار رکھنے کے لئے باہمی مشورے کے نظام اور اس کی روح کو قائم کیا۔ ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾ اور جو کچھ بھی رزق اللہ نے انہیں دیا اس کو وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

بدلہ اور قصاص کی حکمت اور عفو کا موقع و محل

عام طور پر عفو و درگزر اور معاف کرنا تو قابلِ مدح و تعریف بات سمجھی جاتی ہے مگر یہاں اس کے برعکس معاملہ ہے۔ فرمایا : ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴾ "اور وہ لوگ کہ جن پر جب زیادتی کی جائے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔" معلوم ہوا کہ یہاں بالکل ہی رنگ بدل گیا۔ یہاں بدھ مت کے بھکشوؤں والا رنگ نہیں ہے' یہاں تو رنگ کچھ اور ہے۔ یہاں تو بطورِ وصف بتایا جا رہا ہے کہ وہ لوگ جن پر زیادتی ہو' وہ ایسے بے غیرت و بے حمیت نہیں ہیں اور نہ ہی ایسے نرم چارہ ہیں کہ جو چاہے ان کے ساتھ زیادتی اور ظلم کا معاملہ کر جائے اور وہ بیٹھے رہ جائیں۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جان لیجئے کہ ہمارے دین کا مزاج یہ ہے کہ وہ پورے نظامِ اجتماعی کو درست کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا دُنیا میں جب بھی نظامِ عدل و قسط قائم ہوگا تو وہ کامیابی سے چل ہی نہیں سکتا جب تک کہ مجرموں' ظالموں' زیادتی کرنے والوں کو سزا نہ دی جائے۔ عدل و قسط کا تقاضا یہی ہے۔ عفو اور معافی کی بنیاد پر کوئی اجتماعی نظام نہیں چل سکتا۔ عفو اور معافی کی بنیاد پر انسان کی اپنی ذاتی روحانیت میں ترفع ہو سکتا ہے' بلندی ہو سکتی ہے۔ ایک شخص انتقام اور بدلہ لینے پر قادر ہے لیکن پھر بھی وہ معاف کر دے تو یقیناً اس کی روحانی ترقی ہوگی۔

لیکن اجتماعی نظام اس اصول پر نہیں چلے گا۔ یہ دو چیزیں بظاہر متضاد ہیں' ان پر غور کیجئے۔ قرآن مجید ایک طرف انتہائی زور دیتا ہے کہ معاف کرو' درگزر کرو۔ ﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ○ ﴾ (النساء:۱۴۹) "اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاؤ یا (کم از کم) برائی سے درگزر کرو تو (یہ تمہارے لئے بہتر ہے چونکہ) اللہ بھی تو بڑا معاف کرنے والا ہے' حالانکہ وہ (سزا دینے پر) قدرت رکھتا ہے"۔ ایک مقام پر فرمایا : ﴿ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ ﴾ (التغابن:۱۴) "اگر تم معاف کر دیا کرو' درگزر کر دیا کرو' اور بخش دیا کرو تو اللہ بھی غفور اور رحیم ہے۔" اس سے زیادہ زوردار اپیل کوئی اور ہو سکتی ہے کہ تمہیں بھی احتیاج ہے کہ نہیں کہ تمہیں بھی اللہ معاف کرے؟ لہٰذا تم بھی اپنے بھائیوں کو معاف کرو' انسانوں سے درگزر کرو' اللہ تم سے درگزر کرے گا۔ عفو کی ترغیب کا اس سے زیادہ زوردار اور کوئی انداز نہیں ہو سکتا۔

اب سورۂ بقرہ کی یہ آیت ذہن میں لایئے : ﴿ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ (آیت ۱۷۹) "ہوشمندو! تمہارے لئے زندگی قصاص میں ہے" بدلے میں ہے ___ دُنیا کا نظام بگڑ جائے گا اگر عفو ہی عفو ہو۔ مجرموں کے حوصلے بڑھتے چلے جائیں گے۔ ایک مجرم کو معاف کر دیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اگلے پر ہاتھ اٹھائے۔ لہٰذا اسے بدلہ ملنا چاہئے جو تورات کا قانون ہے' جسے قرآن مجید نے کھول دیا ہے :

﴿ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ ﴾ (المائدۃ:۴۵)

"اور ہم نے تورات میں یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان اور دانت

کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برابر کا بدلہ۔"

اس قانون پر عمل ہو تو مفسدوں اور شرپسندوں کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ ایک کو سزا مل جائے گی تو ہزاروں کی آنکھیں کھل جائیں گی' ان کو عبرت حاصل ہو جائے گی۔ یہ ہے نظام کو درست کرنے کی ضرورت۔

چونکہ یہ سورۃ اقامتِ دین کی سورۃ ہے' لہٰذا یہاں نظام کو صحیح و درست رکھنے کے اصول بتائے گئے ہیں۔ جہاں صرف دعوت و تبلیغ کی بات ہو گی وہاں بتایا جائے گا کہ معاف کرو' لوگ تمہیں گالیاں دیں تم انہیں دعائیں دو' لوگ تم پر پتھراؤ کریں تم ان کی خدمت میں پھول پیش کرو۔ ایک مرحلہ یہ بھی ہوتا ہے۔ اور ایک مرحلہ وہ ہے کہ نظامِ عدل و قسط قائم کرنے کے لئے باضابطہ میدان میں آ کر مقابلہ کرو۔ وہ نظام قائم ہو گا تو اس میں تعزیرات بھی ہیں' حدود بھی ہیں' سزائیں بھی ہیں' بدلے بھی ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے بیعتِ خلافت کے بعد جو پہلا خطبہ دیا اس میں یہ الفاظ آتے ہیں : "لوگو! تم میں سے ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہو گا جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کر لوں اور ہر ضعیف میرے نزدیک قوی رہے گا جب تک کہ اس کا حق نہ دلوا دوں۔" اسلام کے نظامِ عدل و قسط میں قصاص اور بدلے کے قوانین کی اس قدر اہمیت ہے۔

غور کیجئے کہ یہ سورۂ مبارکہ مکی ہے اور مکی دور میں تو بدلے اور انتقام کی اجازت ہی نہیں تھی۔ پھر یہ مضمون یہاں کیوں آ رہا ہے؟ یہ مضمون یہاں اس لئے آ رہا ہے کہ پیش نظر یہ رہے کہ نظام یہی قائم کرنا ہے کہ بدلہ لینا ہے۔ اس وقت ہاتھ بندھے ہوئے ہیں بندھے رہیں' لیکن اندر ہی اندر لاوا کھولتا رہے کہ جب بھی ہاتھ کھول دیئے جائیں گے تو یہ جماعت میدان میں آ کر باطل کو للکارنے کے لئے تیار و مستعد ہو —— اور اگر ان کو بنا ہی دیا جائے بدھ مت کے بھکشو' تو وہ میدان میں آنے کا حوصلہ کیسے کریں گے؟ پھر ان کا مزاج ان خطوط پر پرورش ہی کہاں پائے گا؟ یہاں تو ضرورت اس امر کی ہے کہ سینوں میں آگ سلگتی رہے —— رکے ہوئے

اس لئے ہیں کہ ابھی اس کی اجازت نہیں ہے۔ یہ ڈسپلن کی انتہا ہے کہ ماریں کھاؤ لیکن مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھاؤ ـــــ لیکن یہ نہ سمجھو کہ بدلہ ہے ہی نہیں' بدلہ ہے مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا ؎

ابھی نہ چھیڑ محبت کے راگ اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں!

اور علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

نالہ ہے بُلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

چنانچہ لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا حتیٰ کہ وہ وقت آیا جب ہاتھ کھول دیئے گئے :

﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝﴾

"آج سے انہیں اجازت دی جا رہی ہے جن پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے' کہ وہ جنگ کریں (اور بدلہ لیں) اور بالیقین اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔"

آگے چلئے' فرمایا : ﴿ وَجَزٰۗؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ ﴾ "اور برائی کا بدلہ تو برائی ہی ہے' ویسی ہی برائی۔" وہی بات جو سورۂ مائدہ کی آیت ۴۵ میں ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور جیسا زخم لگایا گیا ویسا ہی زخم۔ یہ ہے قصاص کا قانون ﴿ وَجَزٰۗؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ ﴾ یہاں جو دوسرا سَيِّئَة ہے وہ بیان کے لئے ہے' وہ برائی ہے ہی نہیں۔ بدلے میں اگر کسی کا دانت توڑا جائے تو یہ برائی نہیں ہے' لیکن چونکہ ظاہری مشابہت ہے' دونوں کاموں کی شکل ایک ہی ہے' کسی نے کسی کا دانت توڑا اس نے قصاص میں اس کا بھی دانت توڑ دیا' تو درحقیقت یہ سَيِّئَة نہیں ہے۔ اس فعل کی ظاہری مشارکت کی وجہ سے لفظ سَيِّئَة استعمال ہوا۔

﴿ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ ﴾ "ہاں جو (برائی کا بدلہ برائی سے

لینے پر قادر ہونے کے باوجود) معاف کردے اور اصلاح کی کوشش کرتا رہے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔" انفرادی سطح پر واقعی یہ عمل روحانی ترفع کا ذریعہ بنتا ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا : ﴿ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ "یقیناً اللہ تعالیٰ کو ظالم لوگ پسند نہیں ہیں" —— برائی کا بدلہ لینے اور برائی کی سزا دینے کا ضابطہ اس کی شانِ عدل کا مظہر ہے۔

بدلہ لینے پر کوئی ملامت نہیں

اگلی آیت میں فرمایا :

﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ ﴾

"اور جو کوئی اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیتا ہے اس پر ملامت کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

غور کیجئے یہاں رہبانیت اور بدھ مت کے بھکشوؤں کے تصور کو جڑ سے کاٹا جا رہا ہے۔ اگر کوئی بدلہ لے رہا ہے تو کوئی برائی نہیں ہے۔ اسے کسی قسم کی ملامت نہیں کی جا سکتی۔ کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ضرور معاف کردے اور بدلہ نہ لے۔ نہیں! بدلہ اس کا حق ہے جس کے ساتھ برائی کی جائے۔ وہی بات جو sex کے بارے میں سورۃ مؤمنون اور سورۃ معارج میں کہی گئی تھی کہ جو لوگ اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر اندر رہتے ہوئے اپنی جنسی خواہش اور اس کے داعیہ کو جائز طریقہ سے پورا کریں تو ان کے لئے کوئی ملامت نہیں : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ ﴾ یہ جنس فی نفسہٖ کوئی شر نہیں ہے' یہ جذبہ اور یہ داعیہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت کیا ہے' بقائے نسل اس کی غایت ہے۔ فی نفسہٖ یہ شر نہیں ہے۔ اگر جائز راستے سے انسان اس جذبہ کی تسکین کرتا ہے تو اس پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ بعض مذاہب بالخصوص عیسائیت میں نکاح اور گھر گرہستی کو گھٹیا درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے۔ وہی بات یہاں فرمائی گئی ہے کہ جس پر ظلم ہوا ہے وہ اگر

بدلہ لے رہا ہے تو کسی ملامت کا کوئی مقام نہیں ہے : ﴿ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ ﴾

آگے فرمایا:

﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾

"ہاں' ملامت کے مستوجب اور مستحق تو وہ لوگ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور جو زمین پر ناحق سرکشی کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

صبر اور عفو کی تلقین

﴿ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ ﴾

"البتہ جو شخص صبر کرے (جھیلے' برداشت کرے' تحمل اختیار کرے) اور معاف کردے تو یہ نہایت باہمت کاموں میں سے ہے۔"

یہ پانچ آیات ۳۹ تا ۴۳ کس موضوع پر ہیں! بدلہ اور بدلہ کی اہمیت' اس کا مقامِ مدح میں ذکر کیا جاتا اور اس کے خلاف جو تصورات و تخیلات ہیں ان کی مذمت۔ یہ نہ سمجھو کہ بدلہ لینے والا کوئی گھٹیا کام کرتا ہے' یہ اس کا حق ہے' اس پر کوئی ملامت نہیں ہوگی۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص بدلے کی قدرت رکھتے ہوئے معاف کردے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ اللہ اس کو بہتر بدلہ دے گا۔

ہوا کا رخ

یہ تمام باتیں اس سورۂ مبارکہ میں اس لئے بیان ہوئیں کہ ہوا کا رخ پہچان لیا جائے اور اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ توحید عملی کی یہ دعوت کس رخ پر آگے بڑھے گی۔ جو نظام قائم کرنا اس کا ہدف ہے' وہ کوئی راہبانہ نظام نہیں ہے' بلکہ وہ پورا

نظام مبنی بر عدل و قسط نظام ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا : ﴿ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ﴾ "مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے مابین عدل کروں۔" پھر وہ آیت : ﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ؕ ﴾ "اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب بھی نازل کی اور میزان بھی نازل کی۔" اس میزانِ عدل کو نصب کرو اور اس کی رو سے جو مستوجب سزا ہے اس کو سزا دو۔

ہدایت وضلالت کا ضابطہ

﴿ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ ﴾

"اور جسے اللہ ہی گمراہ کردے پھر اس کے بعد اس کا کوئی دوست (ساتھی اور مددگار) نہیں بن سکتا۔"

یہاں "اللہ ہی گمراہ کردے" کا کیا مطلب ہے! جس کی گمراہی پر اللہ کی طرف سے مہر ثبت ہو جائے۔ اللہ گمراہ نہیں کیا کرتا' انسان خود گمراہ ہوتا ہے۔ ہدایت بھی اللہ تعالیٰ زبردستی نہیں دیتا۔ ہدایت کے طالب کو اللہ ہدایت دیتا ہے۔ جو گمراہ ہے اور وہ اپنی ضلالت اور کجی کی وجہ سے ایک انتہا تک پہنچ گیا ہے تو وہاں جا کر اس کے دل پر اللہ بھی آخری مہر تصدیق ثبت فرما دیتا ہے کہ اب یہ جدھر جاتا ہے جائے۔ ﴿ ...نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ ﴾ (النساء:۱۱۵) اب اس نے جو راستہ اختیار کیا ہم نے بھی اس کو اسی کے حوالے کیا' اب یہ Point of no return کو پہنچ چکا ہے کہ اس کی واپسی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ ﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾ (البقرۃ : ۷) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں کوئی سیدھے راستے پر نہیں لا سکتا۔ اس میں حضور ﷺ کے لئے دلجوئی ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں' غمگین نہ ہوں' آپ تشویش نہ رکھیں کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لا رہے۔ ان میں سے بہت سے وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہر لگ چکی ہے' لہٰذا اب وہ کسی صورت میں بھی پلٹنے والے نہیں۔

حسرت بھرا انجام

اسی آیت میں آگے فرمایا :

﴿ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ ﴾

"اور تم ان ظالموں کو دیکھو گے جب یہ عذاب دیکھیں گے (جہنم جب ان کے سامنے آجائے گی) تو یہ کہیں گے کہ ہے کوئی راستہ لوٹ جانے کا؟"

ہے کوئی شکل کہ ہم دنیا میں پھر واپس پہنچ جائیں؟ کوئی اور چانس ملنے کی صورت ہے کہ نہیں! پھر ایسے لوگوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے :

﴿ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ۭ ﴾

"اور تم دیکھو گے ان کو کہ جب وہ جہنم کے سامنے لائے جائیں گے تو ذلت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے اور اس کو نظر بچا کر کن انکھیوں سے دیکھیں گے۔"

ان پر ذلت مسلّط ہو چکی ہو گی۔ ان کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوں گی۔ ان کو اپنا انجام نظر آ رہا ہو گا کہ یہ ہے وہ جہنم جس میں ہم جھونکے جانے والے ہیں۔ جو ذلت و پشیمانی اور رسوائی ان پر چھپی ہوئی ہو گی اس کی وجہ سے ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ مجرم ضمیر انسان آنکھ اٹھا کر اور آنکھ ملا کر کبھی نہیں دیکھتا' وہ کن اَکھیوں سے دیکھتا ہے۔ لہٰذا یہ ظالم جہنم کو نگاہ کے گوشے سے دیکھ رہے ہوں گے۔ ان میں اتنی جرأت نہیں ہو گی کہ نگاہ بھر کر دیکھ سکیں کہ اب یہ جہنم ہی ہمیشہ کے لئے ہمارا ملجاو ماویٰ ہے۔

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ ﴾

"اور اہل ایمان کہیں گے (ان کے اس کہنے میں تأسف کا انداز ہو گا) کہ یہ لوگ ہیں اصل خسارے میں' جنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال

کو قیامت کے دن خسارے میں مبتلا کیا۔"

یعنی دُنیا میں تو انہیں طعنے ملتے تھے کہ تمہاری مت ماری گئی ہے' تم دیوانے ہو' تم Fanatic ہو گئے ہو' تمہیں اپنے مستقبل کا کوئی خیال نہیں ہے' تمہیں اپنے نفع نقصان کی کوئی فکر نہیں ہے۔ یہ طعنے آج بھی ان لوگوں کو ملتے ہیں جو دین پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی یہ طعنے ملتے تھے : ﴿غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ﴾ منافقین مدینہ مخلصین مؤمنین کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ان کے دین نے ان کی مت ماردی ہے' ان کو دھوکے میں مبتلا کر دیا ہے' انہیں اپنے نفع نقصان کی فکر ہی نہیں' ان کا دماغ خراب ہوا ہے۔ یہ چلے ہیں قیصر روم کے ساتھ جنگ کرنے! ع بازی بازی بار لیشِ بابا ہم بازی!! ـــــ اب تک تو چلو عرب کے اندر ہی جنگ تھی۔ ایک کے مقابلے میں تین تھے۔ بدر میں یہی تناسب تھا۔ اُحد میں بھی ابتداء میں ایک اور تین کی نسبت تھی۔ بعد میں جب رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبَی اپنے آدمی لے کر واپس چلا گیا تو ایک اور چار کی نسبت رہ گئی۔ ابھی تو زیادہ سے زیادہ ایک اور دس کا تناسب رہا ہو گا' اس سے زیادہ تو نہیں۔ لیکن کہاں سلطنتِ روما! وقت کی عظیم ترین مملکت!! اسے حال ہی میں سلطنتِ کسریٰ کے خلاف بہت بڑی فتح حاصل ہوئی ہے اور ان کا morale بہت اونچا ہے۔ منافقین کہا کرتے تھے کہ ان کی تو عقلیں ماری گئی ہیں' انہیں کچھ نظر نہیں آرہا' یہ اپنے دینی جوش میں اندھے ہو گئے ہیں۔ ﴿غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ﴾ قیامت کے دن یہی مؤمنین کہیں گے کہ اصل میں اندھے ہم نہیں' یہ ہو گئے تھے۔ جیسے سورۂ ن میں فرمایا : ﴿فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝﴾ "(اے نبی!) عنقریب آپؐ بھی دیکھ لیں گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے کون دیوانہ ہو گیا تھا۔" ﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝﴾ "اور تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون ہیں وہ لوگ جو اس کے راستے سے بھٹک گئے اور کون ہیں وہ جو ہدایت یافتہ ہیں۔" آیت کے آخر میں فرمایا :

﴿ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ○ ﴾
"آگاہ ہو جاؤ! یہ ظالم قائم و دائم اور باقی رہنے والے عذاب میں رہیں گے۔"

اللہ کی پکڑ سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہو گا

﴿ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ ﴾
"اور ان کے کوئی حامی و مدد گار نہ ہوں گے جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کر سکیں۔"

شفاعت باطلہ کے تمام خیالات و تصورات اس روز ہوا ہو جائیں گے۔ اس روز اللہ کی پکڑ سے کون چھڑانے والا ہے؟ کون بچانے والا ہے؟ کون اللہ کے فیصلے کے آڑے آنے والا ہے؟ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴾ "جس کی گمراہی پر اللہ کی طرف سے مہر تصدیق ثبت ہو چکی ہو' اب اس کے لئے کوئی راستہ نہیں۔"

اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کی ترغیب اور اعراض پر انذار

﴿ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ○ ﴾
"مان لو اپنے رب کی بات قبل اس کے کہ وہ دن آئے اللہ کی طرف سے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس دن تمہارے لئے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہو گا۔"

﴿ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ ﴾ اے سننے والو! اے قرآن کے پڑھنے والو! اے محمد (ﷺ) کے نام لیواؤ! لبیک کہو اپنے رب کی پکار پر! آیت ۳۸ کے الفاظ یہ تھے ﴿ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ ﴾ وہاں تو اہل ایمان کی تعریف کے طور پر آیا تھا' یہاں ایک عمومی پکار ہے' ان کو بھی پکارا جا رہا ہے جو محمد ﷺ کے ساتھی ہیں۔ رضی اللہ

عنہم اجمعین۔ لیکن ان کے متعلق پہلے ہی بتایا گیا کہ ﴿ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ ﴾ انہوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا۔ انہوں نے اپنی گردنیں کٹوادیں۔ انہوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

لیکن اس آیت کا مخاطب میں اور آپ ہیں ﴿ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۝ ﴾ لبیک کہو اپنے رب کی پکار پر' مانو اپنے رب کے مطالبے کو' کمر کس لو اپنی اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے جو بایں الفاظ بیان ہو چکی : ﴿ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ ﴾ اس سے پہلے پہلے کہ اللہ کی طرف سے وہ دن آدھمکے کہ پھر کوئی اس دن کو لوٹانے والا نہ ہو گا۔ اللہ کی طرف سے جب قیامت کی گھڑی آجائے گی تو اس کو لوٹانے اور ٹالنے والا کوئی نہ ہو گا۔ یہاں جو "مِنَ اللّٰهِ" آیا ہے تو اس کا تعلق یوم سے ہے۔ اللہ کی طرف سے جب وہ دن آدھمکے تو اس کو لوٹانے والا کوئی نہیں۔ قیامت کی گھڑی جب آئے گی وہ ٹالی نہ جائے گی۔ ایک چھوٹی قیامت بھی تو ہے جو ہر شخص کے سامنے ہے' یعنی موت اور وہ تو بالکل قریب ہے۔

ع دُنیا سے قیامت دُور سہی' دُنیا کی قیامت دُور نہیں!

ایک تو بڑی قیامت آئے گی جس میں کائنات کا یہ سلسلہ تمام کا تمام درہم برہم ہو جائے گا اور ایک قیامت انفرادی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا : ((مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ)) "جو مر گیا اس کی قیامت تو قائم ہو گئی۔" تو اپنے رب کی پکار پر لبیک کہو اس سے پہلے پہلے کہ یہ دُنیا کی قیامت آجائے' جس کے متعلق سورۂ منافقون کے آخر میں فرمایا :

﴿ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَا اَخَّرْتَنِيْ اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ

مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ ﴾

"اور جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اس وقت وہ کہے کہ اے میرے رب! کیوں نہ تُو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا ـــــ حالانکہ جب کسی کے لئے موت کا معین وقت آ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے ہرگز مؤخر نہیں کرے گا۔"

یہاں فرمایا : ﴿ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ○ ﴾ "اس دن تمہارے لئے نہ کوئی پناہ گاہ ہو گی اور نہ اس دن تمہاری طرف سے کوئی انکار کر سکے گا۔" یا "نہ ہی تمہاری طرف سے کوئی پوچھ گچھ کرنے والا ہو گا۔" نکیر کے یہ دونوں ترجمے کئے گئے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ اگر کبھی آپ کے کسی عزیز یا واقف کار کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہو تو آپ جا کر پوچھ گچھ کرتے ہیں کہ اس کو کیوں پکڑا ہے! اس کا کیا جرم ہے؟ اس نے کیا خطا کی ہے؟ لیکن وہاں روزِ قیامت کوئی نہیں ہو گا جو جا کر پوچھ گچھ کر سکے۔ اس دُنیا میں بعض ممالک کے بارے میں یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ وہاں اگر پولیس کسی کو پکڑ کر لے جائے تو کوئی پولیس کے پاس جا کر یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کرتا کہ اس کو کیوں پکڑا ہے۔ اس لئے کہ جو پوچھنے جائے گا اسے بھی دھر لیا جائے گا۔ ایسا نظام بھی بالفعل دُنیا میں بعض مسلمان ممالک میں موجود ہے۔ تو یہاں "نکیر" یہ مفہوم بھی دے رہا ہے کہ کوئی پوچھ نہ سکے گا کہ اس کو پکڑا ہے تو کیوں پکڑا ہے۔ تو یہاں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اس سے پہلے پہلے کہ وہ دن آ جائے کہ جس کا نہ لوٹانا ممکن ہو' نہ اس روز کسی کو کوئی جائے پناہ میسر آئے' نہ کوئی انکار کر سکے' نہ ان کی طرف سے کوئی پوچھ گچھ کرنے والا ہو' اپنے رب کی پکار پر لبیک کہو۔ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ۔

اگلی آیت میں خطاب کا رخ ہو گیا حضور ﷺ کی طرف۔ بڑا پیارا انداز ہے۔ فرمایا : ﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ ﴾ اے نبی (ﷺ!) اگر یہ سب

کچھ سن لینے کے بعد یہ لوگ اعراض کریں' سب کچھ پی جائیں' ٹس سے مس نہ ہوں تو آپ ملول نہ ہوں' غمگین نہ ہوں۔ ہم نے آپ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا۔ یہ تو انسان کا اپنا فیصلہ ہے کہ ﴿ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴾ آپ کا کام ہے ہدایت کی راہ کھول دینا اور دکھا دینا۔ آپ کا کام ہے ذمہ داریوں کو بیان اور واضح کر دینا۔ آپ کا فرضِ منصبی ہے حق کو مبرہن کر دینا' واشگاف کر دینا۔ آپ کے ذمہ ہے ابلاغ اور تبلیغ کا حق ادا کرنا۔ یعنی : ﴿ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ﴾ آپ نے یہ سب کچھ جب بیان کر دیا پھر بھی وہ اعراض کر رہے ہیں۔ آپ نے ہماری پکار لوگوں تک پہنچا دی۔ پکار تو اللہ کی ہے' اسے حضور ﷺ اپنی زبانِ مبارک سے ادا فرما رہے ہیں' جیسا کہ اذان بظاہر تو موذن کی زبان سے نکل رہی ہے لیکن ہے تو وہ اللہ کی پکار ؎

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی' دل محفل کا تڑپا بھی گئی!!

آواز کسی اور کی ہے لیکن پکار کسی اور کی ہے۔ تو اے محمد (ﷺ) یہ پکار ہماری ہے : ﴿ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ ﴾ ادا آپ کی زبان سے ہو رہی ہے۔ ﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ ﴾ یہ لوگ پھر بھی نہ مانیں' پیٹھ دکھائیں تو آپ قطعاً ملول نہ ہوں۔ آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ سورۂ غاشیہ میں اسی بات کو اس اسلوب سے بیان کیا گیا : ﴿ فَذَكِّرْ ۣ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ؀ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَۜيْطِرٍ ؀ ﴾ "پس (اے نبی!) آپ یاد دہانی کراتے رہیے۔ آپ تو بس نصیحت ہی کرنے والے ہیں' ان پر داروغہ نہیں ہیں (کہ ان کو لازماً راہ راست پر لے آئیں گے)"

اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کے موانعات

اگلے الفاظ میں پھر ایک دوسرے دل نشیں اسلوب سے ان موانعات کا ذکر ہے جو انسان کو اللہ کی پکار پر لبیک کہنے سے روکتے ہیں۔ شاید کسی کے پاؤں میں پڑی

ہوئی یہ بیڑیاں کھل جائیں' کسی کو شعور حاصل ہو جائے' کوئی خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائے۔ فرمایا :

﴿ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ○ ﴾

"انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو اس پر پھول جاتا ہے۔ اور اگر اس کا اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا کسی مصیبت کی شکل میں اس پر الٹ پڑتا ہے تو سخت ناشکرا بن جاتا ہے۔"

انسان بڑا تھڑدلا ہے' بہت کم ہمت ہے۔ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں' مثلاً آسائش ہے' دولت ہے' آرام ہے' ثروت ہے' دُنیا کی نعمتیں جمع ہو گئی ہیں تو اترانے لگتا ہے' اکڑنے لگتا ہے' پھولے نہیں سماتا۔ لیکن اگر کہیں کوئی تکلیف آ گئی' کوئی مصیبت آ گئی' اور وہ آتی ہے ان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے' تو انسان بالکل ناشکرا ہو جاتا ہے۔ ہمت بھی ٹوٹ گئی' حوصلہ بھی ہار بیٹھتا۔ اعتدال کی روش اختیار نہیں کرتا۔ جو انسان طالبِ دُنیا ہوتے ہیں وہ نارمل نہیں رہتے۔ دُنیا مل گئی تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے' پاؤں زمین پر ٹک نہیں رہے' گردن اکڑی ہوئی ہے' اور جب ذرا دُنیا چھن گئی' تنگی آ گئی تو بجھ کر رہ جاتے ہیں' کوئی ہمت نہیں' کوئی ولولہ نہیں۔ خود کشیاں ہو جاتی ہیں۔ تو یہ انتہائیں دُنیا میں عموماً نظر آتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا تھا : ﴿ فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ﴾ "جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دُنیا کی چند روزہ زندگی کا برتنے کا سامان ہے۔" یہاں اس سرو سامان میں سے ایک خاص بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ دیکھو انسان کو اولاد بہت پیاری ہے۔ دولت پیاری اور اولاد پیاری۔ لیکن کیا اولاد کے ضمن میں کسی کے ہاتھ میں اختیار ہے؟ اللہ ہی کے ہاتھ میں اس کا فیصلہ ہے۔ فرمایا : ﴿ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ﴾ "آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے۔" ﴿ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ ﴾ "وہ جو چاہتا ہے تخلیق فرماتا ہے۔" آپ کے ہاتھ میں

کوئی اختیار نہیں۔ رحمِ مادر میں کیا چیز پروان چڑھ رہی ہے' آپ کو کچھ پتہ نہیں۔ یہاں بالکل اللہ ہی کا اختیار کارفرما ہوتا ہے : ﴿ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّیَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّکُوْرَ ○ ﴾ "وہ جس کو چاہتا ہے بیٹیاں ہی بیٹیاں دیتے چلا جاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بیٹوں سے نواز دیتا ہے۔" وہ مطلقاً بااختیار ہے۔ اس سے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ اگلی آیت میں فرمایا : ﴿ اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُکْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ ﴾ "یا کسی کے لئے جوڑے جوڑے کر دیتا ہے' بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی۔" ﴿ وَیَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا ؕ ﴾ "اور جس کو چاہتا ہے بانجھ بنا کر رکھ دیتا ہے"۔ کوئی اولاد نہیں' تڑپ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ مال اور اولاد یہ ہیں دُنیا کے سب سے بڑے فتنے : ﴿ اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَةٌ ؕ ﴾ "یہ مال اور اولاد ہی تو تمہارے لئے سب سے بڑی آزمائش ہیں۔" کوئی ہے جو یہ کہہ سکے کہ اولاد میرے اختیار میں ہے' میری محنت سے اولاد ہو سکتی ہے؟ اللہ چاہے تو بانجھ بنا دے۔ لاکھ جتن کر لے کہ اولاد ہو جائے لیکن نہیں ہو سکتی اگر اللہ نہ چاہے۔ اللہ چاہے تو بیٹیاں یا بیٹے دیتا چلا جائے۔ اللہ چاہے تو بیٹے بھی دے اور بیٹیاں بھی' اور ایک متوازن خاندان وجود میں آ جائے۔ اسی بات میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ مال و دولتِ دُنیوی بھی بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اس میں تمہیں دھوکہ لاحق ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ جتنی محنت زیادہ کرو گے اتنا ہی زیادہ کما لو گے' جتنی بے ایمانی کرو گے اتنا ہی شاید تمہیں زیادہ مل جائے گا۔ یہ مغالطے اور دھوکے ہیں جو تم کو لگ گئے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے معیّن ہے۔ کوئی شخص اپنی مقررہ روزی میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جب دُنیا کے تمام معاملات کا یہی مسئلہ ہے تو انسان کو یکسو ہو کر ان چیزوں کو اللہ کے حوالے کر کے اور انہیں صرف متاعِ دُنیا سمجھ کر اپنی توانائیوں' اپنی قوتوں' اپنی صلاحیتوں کا اکثر و بیشتر حصہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لئے کھپا دینا چاہئے۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے اس پُر جلال اسلوب سے : ﴿ اِنَّهٗ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ○ ﴾ "یقیناً وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے۔" سب کچھ جاننے والا' تمام قدرت رکھنے والا تو صرف وہی ذاتِ اقدس و

سجانہ ہے۔ اسی پر تمہارا توکل' اعتماد اور تکیہ ہونا چاہئے۔

پیغامِ عمل

قرآنی آیات اور اسوۂ حسنہ کی روشنی میں توحیدِ عملی اور توحیدِ عملی کا اقامتِ دین سے ربط و تعلق واضح طور پر ہمارے سامنے آگیا۔ اب ہر شخص کا اپنا معاملہ ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور فرائض اس کے عائد کردہ۔ پہنچانے کی اولین ذمہ داری رسول اللہ ﷺ کی تھی' اب اللہ تعالیٰ جسے توفیق دے دے' وہ اس پیغام کو پہنچاتا چلا جائے۔ حضور ﷺ نے ہم کو حکم دیا ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً)) "پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت۔" اب عمل کرنا یا نہ کرنا اس کی ذمہ داری آپ پر ہے' کمر ہمت کسنا نہ کسنا اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر یہ کہ عمل کا ارادہ ہو تو اقامت دین کی جدوجہد اور اپنی دیگر دینی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے کس قافلے کے ساتھ جڑیں؟ کوئی قافلہ موجود ہے یا نہیں ہے؟ کوئی نیا بنائیں تو کس طرح بنائیں؟ یہ عملی مسائل ہیں۔ یہ ہر شخص کے اپنے سوچنے کی بات ہے۔ میں نے قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ کے معروضی مطالعہ سے اپنی امکانی حد تک اور اپنی استعداد کے مطابق جو کچھ سمجھا ہے' مَیں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق بھی عطا فرمائی اور ہمت بھی۔ اس کام کو اجتماعی طور پر انجام دینے کے لئے میں نے "تنظیم اسلامی" کے نام سے ایک جماعت قائم کی ہوئی ہے۔ باقی یہ کہ ہر شخص کو اپنی قبر میں جانا ہے اور اللہ کی عدالت میں اپنے معاملہ کا خود ہی مواجہہ (Face) کرنا ہے۔ ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا﴾ (مریم : ۹۵) ہر شخص کو فرد کی حیثیت سے اللہ کی عدالت میں پیش ہونا ہوگا اور جواب دہی کرنی ہوگی۔ میں آپ کی طرف سے جواب دہی نہیں کروں گا اور نہ آپ میری طرف سے جواب دہی کریں گے۔ میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں' اس پر چل رہا ہوں۔ جو چیزیں ہماری مشترک ہیں انہیں پیش کر رہا ہوں۔ یہ قرآن میرا نہیں ہے' یہ ہم سب کا مشترکہ

سرمایہ ہے۔ یہ ہدایت صرف میرے لئے نہیں ہے' ہم سب کے لئے ہے۔ قرآن کا پیغام' توحید کے تقاضے میں نے آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ اب سوچنا' عمل کی راہ تلاش کرنا اور اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کی فکر کرنا ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے۔

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم

ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم



تنظیم اسلامی

نہ کوئی مذہبی فرقہ ہے

نہ معروف معنیٰ میں کوئی سیاسی جماعت

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت ہے

جو سب سے پہلے پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

اسلام کے عادلانہ نظام یعنی نظام خلافت کو

قائم اور غالب کرنا چاہتی ہے

امیر: حافظ عاکف سعید